تدبّر
لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

تدبّر
لاہور

شمارہ 72
جون 2001ء
ربیع الثانی 1422ھ

مولانا امین احسن اصلاحی

مجلس ادارت
عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)
محبوب سبحانی
سعید احمد
سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے
سالانہ 50.00 روپے
بیرون ملک 250.00 روپے
(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ
پاکستان میں سودی نظام کی ممانعت
عبداللہ غلام احمد 2
تدبر حدیث
درس صحیح بخاری
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی 6
روزے کے احکام
امین احسن اصلاحی / سعید احمد 15
اسالیب قرآن
مخاطب کو متوجہ اور متنبہ کرنے والے اسالیب
خالد مسعود 31
مقالات
نبی ﷺ کی تربیت کا نظام / خالد مسعود 41
آخرت کے بارے میں مغالطے اور جوابات
محبوب سبحانی 51

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم روڈ، ثمن آباد لاہور

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن: خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیے کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20x30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

تدبر حدیث

(جلد اول)

شرح مؤطا امام مالکؒ — مولانا امین احسن اصلاحی

(کتاب الزکوٰۃ، البیوع، الاقضیۃ، الحدود، الاشربۃ، العقول، الجامع، وغیرہ کے منتخب ابواب)

- ترتیب و تدوین : خالد مسعود، سعید احمد
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- مالکی فقہ کی آراء کا محاکمہ
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20x30/8 صفحات 544
- قیمت: 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ ثمن آباد لاہور

عبداللہ غلام احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکستان میں سودی نظام کا خاتمہ

پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے ترپن سال ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں سے علیحدہ اپنا ایک الگ وطن حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کے پیچھے مسلمانوں کا یہ جذبہ کارفرما رہا ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت تشکیل دیں گے جس میں اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ ہوگا اور لوگوں کو اس بات کی مکمل آزادی ہوگی کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن وسنت کی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق بسر کریں۔ اس لیے شروع ہی سے پاکستانی عوام کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ اس ملک میں سود سے پاک معیشت قائم کی جائے۔ چنانچہ ہر آنے والی حکومت قوم کے اس موقف کو تسلیم کرتی اور وعدہ کرتی رہی کہ وہ سودی نظام کو بتدریج ختم کر دے گی۔ مگر افسوس کہ یہ وعدہ، وعدۂ فردا ہی رہا۔ واقعتاً ہر حکومت ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ وقت گزرتا گیا، آخر فیڈرل شریعت کورٹ نے سود سے پاک نظام نافذ کرنے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حکومت نے اس فیصلہ سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ یہ اپیل ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۹ء تک زیر التوا رہی۔ آخر ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو سپریم کورٹ نے سودی نظام کے خاتمہ کے حق میں فیصلہ صادر کیا جس میں حکومت کو مزید ڈیڑھ سال کی مہلت دی اور ہدایت کی کہ وہ اس عرصہ میں ضروری انتظامات اور تیاری کر لے اور یکم جولائی ۲۰۰۱ء کو لازماً سود سے پاک نظام نافذ کر دے۔

مئی ۲۰۰۱ء کے پہلے ہفتہ میں وفاقی وزیر برائے مذہبی امور ڈاکٹر محمود احمد غازی نے ایک سیمینار، جس کا موضوع بحث ''غیر سودی معیشت، مسائل، مشکلات اور حل'' تھا، سے خطاب کرتے ہوئے یہ مژدہ سنایا کہ پاکستان میں سود کے خاتمے کا عمل یکم جولائی ۲۰۰۱ء سے شروع ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کو اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا احساس ہے تاہم ان پر قابو پا کر اقتصادی نظام کو سود سے پاک کر دیا جائے گا اور حرمت ربا کا آرڈیننس جاری ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت نے سود کے خاتمہ کے لیے اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ سپریم کورٹ نے یکم جولائی ۲۰۰۱ء کو ۲۲ قوانین بدلنے کا حکم دیا تھا لہٰذا یکم جولائی کو ۲۲ قوانین تبدیل کر دیں گے۔ ان میں سے ۹۵ فیصد پر نظر ثانی مکمل کر لی گئی ہے۔ پہلے قوانین کو کالعدم کرنے سے جو خلا پیدا ہوگا اس کے لیے چیف ایگزیکٹو متبادل قانون جاری کریں گے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

وفاقی وزیر برائے مذہبی امور ایک نہایت ذمہ دار آدمی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بات انہوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی۔ وفاقی وزیر کے اس خوش آئند بیان کے بعد ایک ہفتے کے اندر ہی یونائیٹڈ بنک نے سود کے خاتمہ کے حق میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف نظر ثانی کے لیے سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ کے سامنے ریویو پٹیشن دائر کر دی اور یہ موقف اختیار کیا کہ آئین کے تحت فاضل عدالت کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی قانون یا شق کو اسلامی دفعات سے متصادم ہونے پر کالعدم قرار دے سکتی ہے لیکن اس شق کی تشریح سے یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوتی ہے کہ فاضل عدالت حکومت کو قانون بنانے کے احکامات جاری کرے۔ اس طرح فاضل عدالت نے ربا کیس کے فیصلہ میں اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔

قطع نظر اس سے کہ فاضل عدالت اپنے فیصلہ میں مجاز تھی یا نہیں، یہ خود اس کے طے کرنے کا معاملہ ہے، سوال یہ ہے کہ سود کے خلاف فیصلہ ہوئے تقریباً سترہ ماہ گزر چکے تھے۔ اس عرصہ کے دوران یونائیٹڈ بنک یا کسی اور حکومتی ادارے نے اس فیصلہ پر اعتراض نہیں کیا مگر جوں ہی وفاقی وزیر برائے مذہبی امور نے سپریم کورٹ کے فیصلہ پر یکم جولائی سے عملدرآمد شروع کرنے کا اعلان کیا یونائیٹڈ بنک کو یکا یک کیونکر یاد آ گیا کہ سپریم کورٹ نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ چنانچہ اس نے بڑی [illegible] ساتھ ریویو پٹیشن دائر کر دی۔ طرفہ یہ کہ مقدمہ کی سماعت کے دوران ہی اٹارنی جنرل پاکستان نے ۵ سال کی مزید مہلت مانگ لی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یونائیٹڈ بنک کو اس اپیل میں حکومت کی طرف سے مکمل تائید حاصل تھی۔ اس سے حکومت کی نیت پر شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ سودی نظام کو ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، یہاں تک کہ اس نے ایک وفاقی وزیر، جو اس کا اپنا نمائندہ ہے، کے بیانات اور وعدوں کو کوئی وقعت نہیں دی۔ اس پر مستزاد یہ کہ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنچ کے فیصلہ کے صرف چار روز بعد وفاقی وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں یہ اعلان کیا کہ حکومت نے بچتوں کو فروغ دینے کے لیے اور عام آدمی کو بچتوں کی ترغیب دینے کی غرض سے ملک میں جاری بچت سکیموں پر منافع کی شرح میں ایک فیصد اضافہ کا فیصلہ کیا ہے۔ من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید!

وزیر خزانہ کا یہ بیان اس بات کا غماز ہے کہ حکومت سود کی شرح میں اضافہ کو مفید اقدام خیال کرتی ہے اور قوم کو تسلی دے رہی ہے کہ تم فکر نہ کرو، سودی نظام کہیں جانے کا نہیں، تم برابر حکومت کو قرض دیتے جاؤ اور مزید سود کماتے جاؤ۔

سود کا محرک بزدلی، خود غرضی، سنگدلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ سودی نظام ضرورت مندوں کو سہارا دینے کے بجائے گرے ہوؤں کا خون چوستا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

آج ہماری قوم کا بچہ بچہ مقروض ہے اور عام آدمی کی زندگی روز بروز اجیرن ہوتی جا رہی ہے۔ حکومت کا یہ حال ہے کہ اصل زر کی واپسی تو دور کی بات ہے، قسطوں پر سود کی ادائیگی کے لیے قاصر ہے اور ملک ان مالی اداروں سے مزید قرضوں کی بھیک مانگ رہی ہے جس سے قومی آزادی اور ملی غیرت سے سودے کر لینے سے بھی دریغ نہیں کیا جا رہا ہے۔

ممکن ہے کہ چند لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ معیشت کے استحکام اور سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے سودی نظام ایک ناگزیر ماحول پیدا کرتا ہے اور اسے ختم کر دیا گیا تو لوگ سرمایہ کاری سے ہاتھ کھینچ لیں گے اور اس کے نتیجہ میں ملک کی اقتصادی حالت مزید ابتر ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ سودی نظام نے پوری اقوام عالم کو تباہ و برباد اور انہیں جنگ و افلاس سے دوچار کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کائنات کا خالق ہے اپنی مخلوق کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ اس کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے۔ وہ سود کے بارے میں یوں فرماتا ہے

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کی مانند جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اب اس کے مرتکب ہوں تو وہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، نماز کا اہتمام کیا، زکوٰۃ ادا کی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور ان کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا نہ وہ کوئی غم لاحق ہوگا۔ اے ایمان والو! اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمہیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمہارا حق مارا جائے“۔ (البقرہ: ۲۷۵-۲۷۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ واضح تنبیہ کے بعد جو لوگ سودی کاروبار کریں گے وہ دوزخی ہیں اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے دائمی دوزخ کی سزا کی وجہ ان کی یہ جسارت ہے کہ وہ

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اگر جذبات سے مغلوب ہو کر سبب سے ہو جاتی ہے تو توبہ کر لینے سے اس کی اصلاح کی امید ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ توبہ کے بعد غفلت سے یہ انسان اللہ تعالیٰ کی معافی کا مستحق ہو جائے۔ لیکن نہایت واضح یاد دہانی اور تنبیہ کے بعد جو کوئی شخص کسی حکم کی خلاف ورزی پر مسلسل اصرار کیے چلا جا رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے حکم کو رد کر رہا ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ ایمان کا بھی دعویٰ کرتا ہے تو یہ اس کی ایسی منافقت ہے جو اس کا سارا مذہب مشکوک بنا دیتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی ان کو جہنم کے دائمی عذاب میں جھونک دے گا جو کفار اور منافقین کے لیے مقرر ہے۔

آیت کے الفاظ فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ کی نوعیت بالکل اعلان جنگ کی ہے یعنی اب جو اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔ اس آیت سے صاف طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنے والوں کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کی سرپرستی کرنے والے بدرجہ اولیٰ ان میں شامل ہوں گے۔

حکومت اللہ تعالیٰ کے حکم کو واضح طور پر جانتے ہوئے اگر سودی نظام کو جاری رکھنے پر اصرار کر رہی ہے تو اللہ تعالیٰ کے غضب کو براہ راست دعوت دے رہی ہے۔ اس کا مزید مہلت طلب کرنا اس کے اپنے مفاد میں ہے نہ قوم و ملت کے مفاد میں۔ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلیٹ بنچ نے تحقیقی فیصلہ دے کر ایک نہایت مستحسن فیصلہ کیا ہے۔ البتہ ایک سال کی مہلت دے کر اس نے حکومت کو ایک اور موقع فراہم کیا ہے۔ حکومت اگر مخلص ہے تو اس کو اس مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے کیونکہ ملک اور قوم کی خیر خواہی اور فلاح اسی میں ہے کہ سودی نظام کو جلد سے جلد ختم کیا جائے۔ بلاشبہ ایک نظام کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ایک مختلف نظام کو رائج کرنا آسان نہیں۔ اس کے عملی نفاذ میں بے شمار مشکلات درپیش ہوں گی۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ حکومت مشکلات کو بہانہ بنا کر اس معاملہ کو تاخیری حربوں سے ٹالتی رہے۔ اس وقت حکومت کا لائحہ عمل قوم پر واضح نہیں ہے اس لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ حکومت عملی اقدام کرے کہ قوم کو اعتماد میں لے اور یک سالہ مہلت کو اس طرح ضائع نہ کرے جس طرح اس نے پہلی مہلت کو ضائع کر دیا۔ اس سلسلے میں حکومت کو مخلصانہ قدم اٹھانا چاہیے اور اہل علم اور ماہرین اقتصادیات کی طرف سے تجاویز و آراء کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ ایسے حضرات کو چاہیے کہ وہ بھی کھلے دل سے اس کو ملی اور دینی فرض سمجھتے ہوئے اپنی تجاویز اور آراء سے حکومت کی مدد کریں۔ مفید تجاویز کی اشاعت کے لیے ”تدبر“ کے صفحات حاضر ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب البیوع کی روایات)

۞ حدثنا عبداللہ بن یوسف: اخبرنا مالک، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: ان رسول اللہ ﷺ نہی عن المزابنۃ.

والمزابنۃ: اشتراء الثمر بالتمر کیلا، وبیع الکرم بالزبیب کیلا.

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور مزابنہ یہ ہے کہ درخت پر کی کھجور خشک کھجور کے بدلے ماپ کر خریدے۔ اسی طرح بیل پر کے انگور منقے کے بدل ماپ کر خریدے۔

۞ حدثنا عبداللہ بن یوسف: اخبرنا مالک، عن داود بن الحصین، عن ابی سفیان، مولی ابن ابی احمد، عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ: ان رسول اللہ ﷺ نہی عن المزابنۃ والمحاقلۃ. والمزابنۃ: اشتراء الثمر بالتمر فی رؤوس النخل.

ترجمہ: ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا ہے۔ اور مزابنہ یہ ہے کہ کھجور جو ابھی درخت پر لگی ہو زمین پر کی خشک کھجور کے بدلے خریدے۔

وضاحت: اس روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ درخت پر کے پھل اور زمین پر کے خشک پھل کے درمیان بیع نہیں ہو سکتی۔ احناف کے نزدیک درخت پر کا پھل توڑ کر زمین پر ڈھیری لگا دی جائے تو پھر بیع ہو سکتی ہے۔ بہرحال احناف اس پر تو نگاہ رکھتے ہیں کہ زندگی کی گاڑی چلتی رہے۔ وہ گاڑی کو ٹھپ نہیں کرنا چاہتے۔

۞ حدثنا مسدد: حدثنا ابو معاویۃ، عن الشیبانی، عن عکرمۃ، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: نہی النبی ﷺ عن المحاقلۃ والمزابنۃ.

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا۔

۞ حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ: حدثنا مالک، عن ابن عمر، عن زید ابن ثابت

رضی اللہ عنہم: ان رسول اللہ ﷺ ارخص لصاحب العریۃ ان یبیعها بخرصها.

زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عریہ کے مالک کو یہ اجازت دی ہے کہ اندازہ تخمینہ کر کے بیچ ڈالے۔

وضاحت: تخمینہ، ماپ اور وزن کی طرح، اس طرح کے کاروبار میں اہمیت رکھتا ہے۔ خیبر کے باغوں کی بیع بھی تخمینے کے ذریعہ ہوتی تھی۔

۸۳. باب: بیع الثمر علی رؤوس النخل بالذهب والفضة

باب: کھجور کے درخت پر کا پھل سونے اور چاندی کے عوض بیچنا

۞ حدثنا یحیی بن سلیمان، حدثنا ابن وهب: اخبرنا ابن جریج، عن عطاء، وابی الزبیر، عن جابر رضی اللہ عنہ قال: نہی النبی ﷺ عن بیع الثمر حتی یطیب، ولا یباع شیء منہ الا بالدینار والدرهم، الا العرایا.

ترجمہ: جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھل کا بیچنا اس وقت تک منع کیا جب تک اس کی پختگی نہ شروع ہو اور یہ بھی ہدایت فرمائی کہ درخت کا پھل دینار یا درہم کے عوض نہ بیچا جائے۔ مگر آپ نے عرایا میں اس کی اجازت دی۔

وضاحت: یہاں یطیب کا لفظ ہے اور بعض جگہ بدو صلاح کا لفظ ہے۔ اس سے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں یہ اضافہ بھی ہے کہ درخت کے پھل کی بیع دینار اور درہم کے عوض نہیں ہو سکتی۔ صرف عرایا اس سے مستثنیٰ ہیں یعنی عریہ میں تازہ کھجور کے بدلے آپ خشک کھجور دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ دینار و درہم (یعنی روپیہ پیسہ) کے علاوہ کیا اور کوئی چیز بھی قیمت بن سکتی ہے۔ مثلاً باغ والا چاہتا ہے کہ گھوڑا، گاڑی یا زمین اس کے بدلے میں لے تو دونوں کی قیمت لگانی پڑے گی اور تخمینہ کر کے کوئی چیز روپیہ کے بدل دے دی جائے تو یہ جائز ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو قیمت کا کام دے سکتی ہے اس کے ذریعے سے آپ بیچ سکتے ہیں۔

۞ حدثنا عبداللہ بن عبدالوهاب قال: سمعت مالکا، وسالہ عبداللہ بن الربیع: احدثک داود، عن ابی سفیان، عن ابی هریرۃ رضی اللہ عنہ: ان النبی ﷺ رخص فی بیع العرایا فی خمسۃ اوسق، او دون خمسۃ اوسق؟ قال: نعم.

ترجمہ: امام مالک سے عبیداللہ بن ربیع نے پوچھا کہ کیا آپ سے داؤد بن حصین نے ابوسفیان اور ابوہریرہ کے حوالے سے یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے عرایا کی بیع کی اجازت پانچ وسق یا پانچ وسق سے کم میں دی تو انہوں نے کہا ہاں۔

وضاحت: امام کے نزدیک پانچ وسق اتفاقی ہے لیکن مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر رہے اس سے زیادہ نہ ہو کہ بیع کا مستقل طریقہ نہ بن جائے۔

◉ حدثنا علي بن عبدالله: حدثنا سفيان قال: قال يحيى بن سعيد: سمعت بشيرا قال: سمعت سهل بن ابي حثمة: أن رسول الله ﷺ نهى عن بيع الثمر بالتمر، ورخص في العرية ان تباع بخرصها، يأكلها اهلها رطبا.

وقال سفيان مرة أخرى: الا انه رخص في العرية يبيعها اهلها بخرصها يأكلونها رطبا. قال: هو سواء. قال سفيان: فقلت ليحيى وانا غلام: ان اهل مكة يقولون: ان النبي ﷺ رخص في بيع العرايا. فقال: وما يدري اهل مكة؟ قلت: انهم يروونه عن جابر، فسكت. قال سفيان: انما اردت ان جابرا من اهل المدينة. قيل لسفيان: وليس فيه: نهى عن بيع الثمر حتى يبدو صلاحه؟ قال: لا.

ترجمہ: سہل بن ابی حثمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے درخت پر لگی کھجور خشک کھجور کے عوض بیچنے سے منع فرمایا اور عریہ کی اجازت دی ہے تاکہ باغ کے مالک پھل کا تخمینہ لگا کر اس کے بدلے تازہ کھجور کھانے کے لیے لے سکیں۔ اور سفیان نے دوسری بار یہ الفاظ کہے کہ بجز اس کے کہ آپ نے عریہ میں رخصت دی کہ اس کے مالک تخمینہ لگا کر اس کو بیچ دیں تاکہ تازہ کھجور کھا سکیں۔ سفیان نے کہا کہ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے۔ اور سفیان نے بتایا کہ میں ابھی لڑکا تھا کہ میں نے یحییٰ بن سعید سے کہا کہ مکہ والے یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو بیع عرایا کی اجازت دی۔ انہوں نے کہا کہ مکہ والوں کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی۔ میں نے کہا وہ اس حدیث کو حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں۔ یہ سن کر یحییٰ چپ ہو رہے۔ سفیان کہتے ہیں کہ میرا مطلب یہ تھا کہ جابر مدینہ والے ہیں۔ سفیان سے کسی نے پوچھا کیا اس حدیث میں پھلوں کو اس وقت تک بیچنے کی ممانعت نہیں ہے جب تک کہ ان کی پختگی واضح نہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا نہیں۔

وضاحت: اس روایت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اہل مکہ یہ بات کیسے کہتے ہیں جب کہ یہ معاملہ ان کے

سامنے پیش نہیں آیا۔ جب بتایا گیا کہ ان سے یہ روایت جابر نے کی ہے جو مدینہ کے ہیں تو یحییٰ بن سعید خاموش ہو گئے۔ مطلب یہ کہ اس صورت میں اہل مکہ کی روایت کو مجہول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۸۴۔ باب: تفسير العرايا

باب: عرایا کی تفسیر

وقال مالك: العرية ان يعري الرجل الرجل النخلة، ثم يتأذى بدخوله عليه، فرخص له ان يشتريها منه بتمر.

وقال ابن ادريس: العرية لا تكون الا بالكيل من التمر يدا بيد، لا يكون بالجزاف. ومما يقويه قول سهل بن ابي حثمة: بالاوسق الموسقة.

وقال ابن اسحق في حديثه عن نافع، عن ابن عمر رضي الله عنهما: كانت العرايا ان يعري الرجل في ماله النخلة والنخلتين.

وقال يزيد عن سفيان بن حسين: العرايا نخل كانت توهب للمساكين، فلا يستطيعون ان ينتظروا بها، رخص لهم ان يبيعوها بما شاؤوا من التمر.

امام مالک کا قول ہے کہ عرایا سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص ایک شخص کو کھجور کے چند درخت دے، پھر وہ اس بات سے تکلیف محسوس کرے کہ وہ شخص اس میں داخل ہو تو اس کو یہ اجازت دے دی گئی کہ اس سے پھل کو خشک کھجور کے بدلے میں بیچ سکتا ہے۔ ابن ادریس نے کہا کہ عریہ صرف اس شکل میں ہو سکتا ہے کہ خشک کھجور ناپ کر نقد انقد دی جائے اور تخمینہ سے نہ دی جائے۔ اس کی تائید سہل بن ابی حثمہ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ مبادلہ پیمانہ سے تولی ہوئی چیز سے ہو۔ ابن اسحاق نے اپنی روایت میں نافع سے اور انہوں نے ابن عمرؓ کے حوالے سے کہا کہ عریہ یوں ہوتا کہ کوئی شخص اپنے باغ میں سے ایک یا دو کھجور کے درخت کسی کو دے دیتا۔ یزید بن سفیان بن حسین کا قول ہے کہ عرایا کھجور کے وہ درخت ہوتے جو مساکین کو اللہ کی راہ میں دے دیے جاتے لیکن وہ ان سے پھل اترنے کا انتظار نہ کر سکتے۔ تو اجازت دے دی گئی کہ خشک کھجور کے بدلے جس کے ہاتھ چاہیں بیچ دیں۔

◉ حدثنا محمد: أخبرنا عبدالله: أخبرنا موسى بن عقبة، عن نافع، عن ابن عمر، عن زيد بن ثابت رضي الله عنهم: أن رسول الله ﷺ رخص في العرايا أن تباع بخرصها كيلا.

قال مُوسى بْنُ عُقْبَةَ: والعرايا نخلات" معلومات" تَأتيها فتشتريها.

ترجمہ: زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرایا کے باب میں رخصت دی ہے کہ ان کا تخمینہ کر کے ناپ کے حساب سے بیچ دیا جائے۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ عرایا وہ متعین کھجور کے درخت ہیں جن کے لیے تم آ ؤ اور خرید لو۔

وضاحت: حضرت زید بن ثابتؓ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ درخت پر جو تازہ کھجور ہے اس کا تخمینہ کیا جائے کہ کتنی کھجور ہے اور اس کے بدلے خشک کھجور ناپ کر دے دی جائے گی۔ لیکن موسیٰ بن عقبہ کی بات مبہم ہی ہے جس سے عرایا کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔

۸۵. باب: بَيْعِ الثِّمَارِ قَبْلَ أَنْ يَبْدُوَ صَلاحُهَا

باب: صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے پھل (باغ) بیچنا

۞ وقال اللَّيْثُ، عَنْ أبي الزِّنَادِ: كَانَ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ يُحدِّثُ عَنْ سَهْلِ بْنِ أبي حَثْمَةَ الْأَنْصَارِيِّ، مِنْ بَنِي حَارِثَةَ: أَنَّهُ حدَّثَهُ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّاسُ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَتَبَايَعُونَ الثِّمَارَ، فَإِذَا جَدَّ النَّاسُ وَ حَضَرَ تَقَاضِيهِمْ، قَالَ الْمُبْتَاعُ: إِنَّهُ أَصَابَ الثَّمَرَ الدُّمَانُ، أَصَابَهُ مُرَاضٌ"، أَصَابَهُ قُشَامٌ"، عَاهَاتٌ" يَحْتَجُّونَ بِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَمَّا كَثُرَتْ عِنْدَهُ الْخُصُومَةُ فِي ذَلِكَ: فَإِمَّا لا، فَلا تَتَبَايَعُوا حَتَّى يَبْدُوَ صَلاحُ الثَّمَرِ. كَالْمَشُورَةِ يُشِيرُ بِهَا لِكَثْرَةِ خُصُومَتِهِمْ.

وَأَخْبَرَنِي خَارِجَةُ بْنُ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ: أَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ لَمْ يَكُنْ يَبِيعُ ثِمَارَ أَرْضِهِ حَتَّى تَطْلُعَ الثُّرَيَّا، فَيَتَبَيَّنَ الْأَصْفَرُ مِنَ الأَحْمَرِ.

قَالَ أَبُوعَبْدِاللَّهِ: رَوَاهُ عَلِيُّ بْنُ بَحْرٍ: حَدَّثَنَا حَكَّامٌ": حَدَّثَنَا عَنْبَسَةُ، عَنْ زَكَرِيَّاءَ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ سَهْلٍ، عَنْ زَيْدٍ.

ترجمہ: لیث نے ابوالزناد سے نقل کیا کہ عروہ بن زبیر بنی حارثہ کے سہل بن حثمہ سے اور وہ زید بن ثابت سے روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لوگ پھلوں کی (باغوں کی) خرید وفروخت کرتے تھے۔ لوگ جب پھل توڑنے آتے اور بیچنے والے قیمت وصول کرنے کے لیے حاضر ہوتے تو خریدار کہتے کہ اس باغ کا تو گابھا خراب ہو گیا۔ مراض کا روگ لگ گیا۔ قشام کی آفت آ گئی۔ وہ ان آفتوں کا نام لے لے کر جھگڑے نکالتے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ اس باب میں لوگوں کے

جھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اگر خصومت کا سلسلہ ختم نہیں کرتا ہے تو پھر یہ ہو کہ لوگ اس وقت تک باغ نہ بیچیں جب تک کہ پھل کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے۔ آپ نے ان کے جھگڑوں کی کثرت دیکھ کر یہ بطور صلاح اور مشورہ کے فرمایا۔ اور ابوالزناد نے کہا کہ مجھ کو خارجہ بن زید بن ثابتؓ نے خبر دی کہ زید بن ثابتؓ اپنے باغ کا میوہ اس وقت تک نہ بیچتے جب تک کہ ثریا تارا نہ نکلتا اور زردی اور سرخی نمایاں نہ ہوتی۔ ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ اس روایت کو علی بن بحر نے بھی حکام، عنبسہ، زکریا، ابوالزناد، عروہ، سہل اور زید بن ثابت کی سند سے بیان کیا ہے۔

وضاحت: اس باب میں جو روایت زید بن ثابتؓ سے بیان کی گئی ہے وہ بہت اہم ہے۔ زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں باغ بیچنے والوں اور خریدنے والوں کے درمیان جھگڑے بہت بڑھ گئے۔ خریدنے والے طرح طرح کی بیماریوں کو بطور عذر پیش کر کے کہتے کہ ہم قیمت ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جھگڑوں کا سلسلہ ختم کرنا چاہتے ہو تو پھر یہ بات ہو سکتی ہے کہ جب تک پھل کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے لوگ باغ نہ بیچیں۔ راوی بتاتے ہیں کہ یہ بات حضور نے بطور مشورہ کہی، امرونہی کے ساتھ روکا نہیں۔ یہ وضاحت معمولی بات نہیں، بڑی اہم بات ہے۔ اور راوی اس کے کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ زید بن ثابتؓ ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو حضور کے ارشاد کی نوعیت وہی ہوگی جو تابیرنخل کے مشورہ کی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کھجوروں میں گابھا نہ لگاؤ تو کیا حرج ہے۔ ایک سال لوگوں نے گابھا نہیں لگایا اور پھل بہت کم آیا تو لوگوں نے کہا یارسول اللہ! ہم نے آپ کے مشورہ پر عمل کیا تو پھل بہت کم آیا۔ آپ نے فرمایا انتم اعلم بامور دنیاکم۔ مطلب یہ کہ میں تمہاری دنیاوی تعلیم کے لیے نہیں آیا بلکہ دین کی تعلیم کے لیے آیا ہوں۔ دنیا کے معاملات تم زیادہ جانتے ہو۔ اسی طرح اگر آپ یہاں مان لیں کہ یہ بات مشورہ کے طور پر تھی تو بحث کی جڑ ہی کٹ جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس زمانے میں باغوں کے بیچنے کے لیے ہر وہ طریقہ جو شریعت کے اصولوں کے منافی نہ ہو صحیح ہوگا۔ اب اگر محسوس کیا جائے کہ باغ کو بدوصلاح سے پہلے بیچنا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہوگی کہ اگر خریدار کو خسارہ ہوا تو کیا کریں گے۔ اس معاملہ میں ہمیں تدابیر وہ استعمال کرنا پڑیں گی جو نبی ﷺ کے طریقوں سے ثابت ہیں لیکن صلاحیت ظاہر ہونے کا معاملہ ختم ہو جائے گا کیونکہ یہ کوئی امرونہی والا معاملہ نہیں ہے۔ اب اگر فرض کیجیے کہ دوسری روایتوں میں بدوصلاح کے لحاظ کی ہدایت مل جائے تو یہ راوی حضرات کا لیا ہوا تاثر ہوگا۔ یعنی راوی حضرات کے سامنے جو بات آئی وہ اسی طرح نقل کر دی گئی لیکن اس کا پس منظر غائب ہے۔ بہت سے مشکل معاملات میں یہ ہوا ہے کہ روایت کا پس منظر راوی حضرات بیان نہیں کرتے۔ مثال

کے طور پر روایت الایمۃ من القریش کو لیجئے جو ہمارے ہاں ساری سیاست کی بنیاد ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کے پس منظر میں قریش اور انصار کے درمیان کی ایک عظیم نزاع ہے تب یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے اس نزاع کا فیصلہ فرمایا۔ اور یہ فیصلہ اسی نزاع پر منطبق ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ نبی ﷺ نے نسب کی بنیاد پر قریش کی سیادت وامارت کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ فرمادیا۔ پس منظر کے نہ سمجھنے سے روایت کو سمجھنے میں بڑا فرق ہو جاتا ہے لیکن یہ چیز عاقلوں کے سمجھنے کی ہے۔

باب کی عبارت میں حضرت زید بن ثابت کا یہ قول یوں بیان ہوا ہے کہ وہ ثریا کے نمودار ہونے پر باغ کا سودا کیا کرتے تاکہ سرخ اور زرد واضح ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زید بن ثابت آنحضرت ﷺ کے مشورہ پر عمل کرتے تھے۔ ثریا تارا گرمی میں طلوع ہوتا ہے اور اس کی تاثیر یہ ذکر کی ہے کہ اس وقت جو پھل سرخ ہوتے ہیں وہ سرخی مائل اور جو زرد ہوتے ہیں وہ زرد ہونے لگتے ہیں۔

علی بن بحر کی روایت کا حوالہ دے کر ابوعبداللہ یعنی امام صاحب نے اپنے تراجم پر ایک تعلیق کرکے بتایا ہے کہ یہی مضمون دوسری سند سے بھی ثابت ہے۔ اصل راوی اس روایت میں بھی زید بن ثابت ہی ہیں۔

حدثنا عبدالله بن يوسف: أخبرنا مالك، عن نافع، عن عبدالله بن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله ﷺ نهى عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها، نهى البائع والمبتاع.

ترجمہ: عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کو جب تک کہ ان کی صلاحیت ظاہر نہ ہو بیچنے سے روکا ہے۔ آپ نے بائع اور خریدار دونوں کو روکا ہے۔

وضاحت: خریدنے والے کو خریدنے سے اور بیچنے والے کو بیچنے سے منع کیا ہے۔ یہ ہدایت خصومت سے بچنے کے لیے ہے اس لیے کہ دونوں صورتوں میں خصومت کا امکان ہے۔

حدثنا ابن مقاتل: أخبرنا عبدالله: أخبرنا حميد الطويل، عن أنس رضي الله عنه: أن رسول الله ﷺ نهى أن تباع ثمرة النخل حتى تزهو. قال أبو عبدالله: يعني حتى تحمر.

ترجمہ: انس سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کھجور کا پھل بیچنے سے منع کیا ہے جب تک کہ وہ لال (یا زرد) نہ ہو جائے۔ ابوعبداللہ کہتے ہیں کہ تزھو کے معنی یہ ہیں کہ سرخ ہو جائے۔

حدثنا مسدد: حدثنا يحيى بن سعيد، عن سليم بن حيان: حدثنا سعيد بن

ميناء، قال: سمعت جابر بن عبدالله رضي الله عنهما قال: نهى النبي ﷺ أن تباع الثمرة حتى تشقح. فقيل: ما تشقح؟ قال: تحمار وتصفار و يؤكل منها

ترجمہ: جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس بات سے منع کیا کہ پھل بیچے جائیں اشقاح سے پہلے۔ سوال کیا گیا کہ اشقاح کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ پھل سرخ ہونے لگے یا زرد ہونے لگے اور کھانے کے لائق ہو جائے۔

وضاحت: اصل روایت ایک ہی ہے لیکن لوگ اس میں استعمال ہونے والے مختلف الفاظ کی شرح کر رہے ہیں کہ ازھو کیا ہوتا ہے اور تشقح سے کیا مراد ہے۔ تحمار یعنی پکنے پر جو پھل سرخ ہوتے ہیں ان میں سرخی ظاہر ہونے لگے اور تصفار یعنی جو پھل زرد ہوتے ہیں ان میں زردی ظاہر ہونے لگے۔

۸۶۔ باب: بيع النخل قبل أن يبدو صلاحها

باب: کھجور کے باغ کی بیع قبل اس کے کہ اس کی صلاحیت ظاہر ہو

حدثني علي بن الهيثم: حدثنا معلى: حدثنا هشيم: أخبرنا حميد: حدثنا أنس بن مالك رضي الله عنه، عن النبي ﷺ: أنه نهى عن بيع الثمرة حتى يبدو صلاحها، وعن النخل حتى يزهو. قيل: وما يزهو؟ قال: يحمار أو يصفار

ترجمہ: انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کے بیچنے سے منع فرمایا جب تک کہ ان کی صلاحیت نہ ظاہر ہو جائے اور کھجور کے بیچنے سے منع فرمایا جب تک کہ زہو نہ ہو جائے۔ پوچھا گیا کہ زہو کیا ہے تو فرمایا کہ سرخ یا زرد ہو جانا۔

وضاحت: ان تمام روایتوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کا رجحان اس طرف ہے کہ صلاحیت ظاہر ہو جانے پر باغ کی بیع ہونی چاہیے۔

۸۷۔ باب: اذا باع الثمار قبل أن يبدو صلاحها ثم أصابته عاهة فهو من البائع

باب: جب پھل صلاحیت کے ظہور سے پہلے بیچا گیا ہو اور پھر اس پر آفت آ جائے تو نقصان کی ذمہ داری بائع پر ہے

حدثنا عبدالله بن یوسف: أخبرنا مالکٌ، عن حمید، عن أنس بن مالک رضی الله عنه: أن رسول الله ﷺ نهى عن بيع الثمار حتى تزهي. فقيل له: وما تزهي؟ قال: حتى تحمر. فقال رسول الله ﷺ: أرأيت إذا منع الله الثمرة، بم يأخذ أحدكم مال أخيه.

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ازھاء سے پہلے پھل کی بیع سے منع کیا ہے۔ پوچھا گیا کہ ازھاء کیا ہے تو فرمایا یہاں تک کہ پھل سرخ ہونے لگے، پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پھل سے محروم کردے تو کس چیز کے بدلے میں کوئی شخص اپنے بھائی کا مال لے گا۔

قال الليث: حدثني يونس، عن ابن شهاب قال: لو أن رجلا ابتاع ثمرا قبل أن يبدو صلاحه، ثم أصابته عاهة، كان ما أصابه على ربه. أخبرني سالم بن عبدالله، عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله ﷺ قال: لا تتبايعوا الثمر حتى يبدو صلاحها، ولا تبيعوا الثمر بالتمر.

ترجمہ: یونس نے ابن شہاب سے نقل کیا کہ اگر کسی نے صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے پھل (باغ) خرید لیا پھر کوئی آفت آئی تو جو نقصان ہوگا وہ مالک کے ذمہ ہوگا۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ سے سالم بن عبداللہ نے اور انہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کیا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا پھل اس وقت تک نہ بیچو جب تک کہ اس کی صلاحیت نہ ظاہر ہو جائے اور درخت پر کی کھجور خشک کھجور کے بدلے نہ بیچو۔

وضاحت: پہلی روایت سے یہ بات تو طے ہوگئی کہ بدو صلاح سے پہلے اگر بیع ہوگئی تو وہ بیع جائز ہے۔ ورنہ کہہ دیا جاتا کہ ایسی بیع ہی ناجائز ہے۔ اب اگر سودا ہو جانے کے بعد کوئی آفت آئے اور باغ کا نقصان ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا۔ تو اس روایت کی رو سے نقصان بائع کے ذمہ ہوگا۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ دیکھا جائے گا کہ جو آفت آئی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ اگر آفت ایسی ہے کہ ایک ثلث سے کم نقصان ہوا ہے تو اس کا لحاظ نہیں ہوگا اور یہ کامن سنس کا تقاضا ہے اور اگر نقصان ایک ثلث سے زیادہ ہے تو اس کی تلافی کی جائے گی جو بائع کے ذمہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس وقت نقصان ہوا تو باغ مشتری کی نگرانی میں تھا تو مشتری نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔ اور اگر بیع ہو چکی تھی لیکن باغ ابھی منتقل نہیں ہوا تھا تو بائع اس کا ذمہ دار ہوگا۔ یہ بات بھی بظاہر معقول معلوم ہوتی ہے۔

بقیہ بر صفحہ ۳۰

امین احسن اصلاحی

روزہ کے احکام

(موطا امام مالک کی کتاب الصیام کی روایات)

ما جاء في الصيام في السفر

سفر میں روزہ کا کیا حکم ہے

حدثنی یحیی عن مالک عن ابن شهاب عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبه بن مسعود عن عبدالله بن عباس ان رسول الله ﷺ خرج الی مکة عام الفتح فی رمضان فصام حتی بلغ الکدید ثم افطر فافطر الناس. و کانوا یاخذون بالاحدث فالاحدث من امر رسول الله ﷺ.

ترجمہ: عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح کے سال رمضان میں مکہ کے لیے نکلے تو آپ نے روزہ رکھا۔ پھر جب کدید میں پہنچے تو آپ نے افطار کر لیا اور لوگوں نے بھی افطار کر لیا۔ اور لوگوں کا رویہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ تھا کہ جو آپ کا سب سے آخری عمل ہوتا تھا اس کی پیروی کرتے تھے۔

وضاحت: آنحضرت ﷺ کی اطاعت میں تو یہ ہونا چاہیے کہ آپ کی ہدایات کی پیروی کرتے ہوئے سب سے آخری ہدایت کو حتمی قرار دیا جائے اور لوگ آخری عمل ہی کو سنت قرار دیتے بھی تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے کی بات رسول اللہ ﷺ منسوخ بھی تو کر سکتے تھے لیکن اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ بات نکلتی ہے کہ سفر میں آپ نے روزہ رکھا بھی اور ایک خاص محل میں پہنچ کر افطار بھی کیا یعنی رکھنا چھوڑ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کی مہم چونکہ رمضان میں پیش آئی تھی اس لیے آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو روزہ رکھنے سے منع فرمایا لیکن آپ خود سفر کے ابتدائی دنوں میں روزہ رکھتے رہے اور آپ کے ہمراہ دوسرے لوگوں نے بھی روزہ رکھا۔ لیکن جب لشکر مکہ سے دو تین منزل پہلے کدید میں پہنچا تو آپ نے روزہ نہیں رکھا۔ تب باقی صحابہ نے بھی روزہ رکھنا چھوڑا۔ اس سے حکم یہ نکلا کہ سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے دونوں کی اجازت ہے اور یہی سنت ہے۔

اس معاملہ میں احناف کا مسلک یہ ہے کہ وہ کسی حکم میں دی گئی رخصت پر عمل کو عزیمت قرار

دیے ہیں۔ ان کے نزدیک رخصت سے فائدہ نہ اٹھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ میرے نزدیک رخصت بہرحال رخصت ہی ہے، وہ عزیمت نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھائے لیکن اگر اس کے حالات بہت اچھے ہیں اور آرام دہ سیلون میں سفر کر رہا ہے تو اگر وہ روزہ رکھے تو گناہ گار نہیں ہوگا۔ اسی طرح فرض کر لیجیے کہ ایک شخص موت قبول کر لیتا ہے لیکن حرام نہیں کھاتا تو میرا خیال ہے کہ بعض حالات میں اس کو شہادت کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس پر ملامت تو کسی شکل میں بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر کوئی شخص رخصت سے فائدہ اٹھانے کو تقویٰ کے خلاف سمجھے تو یہ غلط ہے۔ اس کا یہ عمل سنت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

◉ و حدثني عن مالك عن سمي مولى ابي بكر بن عبدالرحمن عن ابي بكر ابن عبدالرحمن عن بعض اصحاب رسول الله ﷺ ان رسول الله ﷺ امر الناس في سفره عام الفتح بالفطر و قال تقووا لعدوكم و صام رسول الله ﷺ قال ابوبكر قال الذي حدثني لقد رايت رسول الله ﷺ بالعرج يصب الماء على راسه من العطش، او من الحر ثم قيل لرسول الله ﷺ يا رسول الله ان طايفة من الناس قد صاموا حين صمت قال فلما كان رسول الله ﷺ بالكديد دعا بقدح فشرب فافطر الناس

ترجمہ: ابوبکر ابن عبدالرحمن رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال سفر میں لوگوں کو افطار کرنے کی ہدایت کی اور کہا کہ دشمن سے مقابلہ کے لیے قوت حاصل کرو اور نبی ﷺ نے خود روزہ رکھا۔ ابوبکر کہتے ہیں کہ جس شخص نے مجھ سے یہ روایت کی بتاتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پیاس کے مارے یا گرمی کے مارے اپنے سر پر پانی انڈیل رہے ہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ کو بتایا گیا کہ یا رسول اللہ، آپ کو روزہ کی حالت میں دیکھ کر کچھ لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا ہے۔ راوی کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کدید پہنچے تو آپ نے پیالہ منگوایا اور پیا تو لوگوں نے بھی افطار کیا۔

وضاحت: اس روایت میں اوپر والی روایت بھی شامل ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی روایت میں راوی نے واقعہ کا اتنا ضروری حصہ بیان میں چھوڑ دیا ہے کہ جس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ اصول میں بتا چکا ہوں کہ چونکہ روایات بالمعنی ہیں تو اس لیے تمام روایات باب کو جمع کر کے مجمل کو مفصل کی روشنی میں غور کر کے قبول کرنا چاہیے۔ اس روایت میں راوی نے واقعات کو اپنے طریقہ پر بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے سفر کے ابتدائی دنوں میں خود روزہ رکھا اور بعض دوسرے لوگ بھی روزہ رکھتے رہے۔ لیکن آپ کا حکم یہ تھا کہ دشمن سے مقابلہ کے لیے لوگ اپنی قوت مجتمع رکھیں اور روزہ نہ رکھیں۔ جب کدید

سے مقام پر حضور کو توجہ دلائی گئی کہ چونکہ آپ خود روزہ رکھ رہے ہیں اس لیے آپ کی اتباع میں دوسرے لوگ بھی روزہ سے ہوتے ہیں تو آپ نے روزہ رکھنا چھوڑ دیا اور اس بات کے اعلان کے لیے آپ نے لوگوں کے سامنے پیالے میں سے پانی پیا۔ معلوم ہوا کہ سفر میں روزہ رکھنا یا چھوڑنا حالات و مصالح پر منحصر ہے اور یہ دونوں عمل سنت ہیں۔

◉ و حدثني عن مالك عن حميد الطويل عن انس بن مالك انه قال: سافرنا مع رسول الله ﷺ في رمضان فلم يعب الصائم على المفطر، ولا المفطر على الصائم.

ترجمہ: حضرت انس سے روایت ہے کہ ہم نے رمضان میں نبی ﷺ کے ساتھ سفر کیا تو آپ نے نہ روزہ دار کو مفطر سے معترض پایا اور نہ مفطر کو روزہ دار سے۔

وضاحت: صائم یعنی روزہ رکھنے والے اور مفطر یعنی چھوڑنے والے۔ مطلب یہ ہے کہ سفر میں وہ لوگ بھی تھے جو روزہ رکھتے رہے اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے روزہ نہ رکھنے کی رخصت سے فائدہ اٹھایا۔ آنحضرت ﷺ نے دوسرے گروہ کو روزہ داروں سے کمتر یا کسی غلطی کا مرتکب نہیں سمجھا۔ گویا دونوں کا عمل درست تھا۔

◉ و حدثني يحيى عن مالك عن هشام بن عروة عن ابيه ان حمزة بن عمرو الاسلمي قال لرسول الله ﷺ يا رسول الله اني رجل اصوم أفاصوم في السفر. فقال له رسول الله ﷺ ان شئت فصم، و ان شئت فافطر

ترجمہ: عروۃ ابن زبیر سے روایت ہے کہ حمزہ بن عمرو الاسلمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول، میں روزہ رکھنے والا شخص ہوں تو کیا میں سفر میں بھی روزہ رکھوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو چاہتا ہے تو روزہ رکھ اور اگر نہیں رکھنا چاہتا تو یہ بھی کر سکتا ہے۔

وضاحت: معلوم ہوتا ہے کہ حمزہ بن عمرو اسلمی کثرت سے روزے رکھتے ہوں گے۔ خاص سفر میں روزہ رکھنے کے حکم کے بارے میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو آپ نے اس معاملہ کو ان کی صوابدید پر چھوڑا کہ اگر روزہ رکھنا چاہو تو رکھو اور اگر چھوڑنا چاہتے ہو تو ایسا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

◉ و حدثني عن مالك عن نافع ان عبدالله بن عمرؓ كان لا يصوم في السفر.

ترجمہ: نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ سفر میں روزہ نہیں رکھتے تھے۔

وضاحت: یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے متشدد صحابی کا عمل بیان ہوا ہے کہ وہ سفر میں روزہ نہ رکھنے کے

قائل تھے۔ یعنی اگر روزہ رکھنا کسی درجہ میں بھی روزہ چھوڑنے سے افضل کام ہوتا تو ان جیسا شخص اس نیکی کو کبھی ترک نہ کرتا۔

و حدثنی عن مالک عن ھشام بن عروۃ عن ابیہ انہ کان یسافر فی رمضان ونسافر معہ فیصوم عروۃ و نفطر نحن فلا یامرنا بالصیام.

ترجمہ: ہشام بن عروۃ روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد رمضان میں سفر کرتے جبکہ ہم بھی ان کے ہم سفر ہوتے تو عروہ روزہ رکھتے جبکہ ہم لوگ روزہ چھوڑ دیتے لیکن عروہ ہمیں روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔

وضاحت: امام صاحب یہ روایت بھی اسی بات کو ثابت کرنے کے لیے لائے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانہ میں اسی بات پر عمل ہوتا رہا کہ سفر میں بعض لوگ روزہ رکھتے لیکن دوسرے نہ رکھتے اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے عمل کو غلط نہ کہتا۔

ما یفعل من قدم من سفر او ارادہ فی رمضان

جو شخص رمضان میں سفر سے آئے یا اس کا ارادہ کرے تو اسے کیا کرنا چاہیے

حدثنی یحیی عن مالک انہ بلغہ ان عمر بن الخطاب کان اذا کان فی سفر فی رمضان فعلم انہ داخل المدینۃ من اول یومہ دخل وھو صائم. قال یحیی. قال مالک من کان فی سفر فعلم انہ داخل علی اھلہ من اول یومہ و طلع لہ الفجر قبل ان یدخل دخل وھو صائم.

ترجمہ: حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ رمضان میں سفر میں ہوتے اور ان کو یہ علم ہوتا کہ وہ دن کے شروع میں مدینہ میں داخل ہوں گے تو وہ روزہ سے داخل ہوتے۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک کا فتوی یہ ہے کہ ایک شخص سفر میں ہو اور اس کو علم ہو کہ وہ دن کے اول حصہ میں گھر والوں میں پہنچ جائے گا اور فجر طلوع ہو جائے قبل اس کے کہ وہ داخل ہو تو چاہیے کہ وہ روزے کی حالت میں داخل ہو۔

وضاحت: حضرت عمرؓ کو جب یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ دن کے اول حصہ میں شہر میں داخل ہو جائیں گے تو وہ روزہ رکھ لیتے۔ اور امام مالک کا فتوی حضرت عمرؓ کے عمل پر مبنی ہے۔ فرض کر لیجیے کہ آپ کراچی سے لاہور آ رہے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ علی الصبح آپ لاہور پہنچ جائیں گے تو آپ کو روزہ کی نیت کر لینی چاہیے۔ ویسے لوگوں کا اس پر عمل نہیں ہے اور ذہن میں میرے بھی یہی ہے کہ آدمی اس صورت میں سفر میں

داخل ہوگا لیکن اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا اور امام مالک کا مذہب یہی ہے کہ روزہ رکھا جائے اور یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

قال مالک و اذا اراد ان یخرج فی رمضان فطلع لہ الفجر وھو بارضہ قبل ان یخرج فانہ یصوم ذالک الیوم.

ترجمہ: امام مالک کا فتوی ہے کہ جب کوئی شخص رمضان میں سفر کے لیے نکلنے کا ارادہ کرے اور فجر طلوع ہو جائے جب کہ وہ ابھی اپنی سرزمین ہی میں ہے تو وہ اس دن کا روزہ رکھے گا۔

وضاحت: مطلب یہ ہے کہ وہ شخص مقیم ہی کے حکم میں ہے اور ارادہ سفر کی بنا پر اس کو یہ حق نہیں ہے کہ اس دن کا روزہ چھوڑ دے۔

قال مالک فی الرجل یقدم من سفرہ و ھو مفطر و امراتہ مفطرۃ حین طہرت من حیضہا فی رمضان فان لزوجہا ان یصیبہا ان شاء.

ترجمہ: امام مالک کا فتوی ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان میں سفر سے گھر واپس آئے اور وہ روزہ سے نہ ہو اور اس کی بیوی حیض سے طہر میں آ گئی ہو اور وہ روزہ سے نہ ہو تو وہ چاہے تو اپنی بیوی سے ملاقات کر سکتا ہے۔

وضاحت: یعنی اگر میاں بیوی دونوں شرعی لحاظ سے روزہ چھوڑے ہوئے ہیں تو ملاقات میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کفارۃ من افطر فی رمضان

رمضان میں کوئی افطار کر لے تو اس کا کفارہ

حدثنی یحیی عن مالک عن ابن شہاب عن حمید بن عبدالرحمن بن عوف عن ابی ھریرۃ ان رجلا افطر فی رمضان فامرہ رسول اللہ ﷺ ان یکفر بعتق رقبۃ، او صیام شہرین متتابعین، او اطعام ستین مسکینا، قال لا اجد فاتی رسول اللہ ﷺ بعرق تمر، فقال خذھذا فتصدق بہ، فقال یا رسول اللہ ما احدا حوج منی فضحک رسول اللہ ﷺ حتی بدت انیابہ ثم قال کلہ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رمضان میں روزہ توڑ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ ایک غلام بطور کفارہ آزاد کرو یا دو ماہ کے لگاتار روزے رکھو یا ساٹھ مساکین کو

کھانا کھلاؤ۔ تو اس شخص نے کہا کہ میں ان چیزوں کی استطاعت نہیں رکھتا۔ تو نبی ﷺ کے پاس کھجوروں کی ایک ٹوکری لائی گئی۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لو اور صدقہ کر دو۔ اس شخص نے کہا یا رسول اللہ میں اپنے سے زیادہ کسی کو محتاج نہیں پاتا تو رسول اللہ ﷺ ہنس دیے۔ یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے اور آپ نے فرمایا چلو تم ہی کھالو۔

◉ **و حدثنی عن مالک عن عطاء بن عبداللہ الخراسانی عن سعید بن المسیب انہ قال: جاء اعرابی الی رسول اللہ ﷺ یضرب نحرہ و ینتف شعرہ و یقول: ھلک الابعد فقال لہ رسول اللہ ﷺ وما ذاک؟ فقال اصبت اھلی و انا صائم فی رمضان فقال لہ رسول اللہ ﷺ ھل تستطیع ان تعتق رقبۃ؟ فقال لا، فقال ھل تستطیع ان تھدی بدنۃ؟ قال لا، قال فاجلس فاتی رسول اللہ ﷺ بعرق تمر فقال خذ ھذا فتصدق بہ فقال ما اجد احوج منی؟ فقال کلہ و صم یوما مکان ما اصبت۔**

ترجمہ: سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ ایک بدو سینہ پیٹتا ہوا اپنے بالوں کو نوچتا ہوا اور یہ کہتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ یہ محروم القسمت انسان ہلاک ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا بات ہوئی۔ اس نے کہا رمضان میں روزے کی حالت میں یہ حرکت کر بیٹھا کہ اپنی بیوی سے ملاقات کر لی۔ نبی ﷺ نے فرمایا کیا تم ایک گردن آزاد کرنے کی استطاعت رکھتے ہو تو اس نے کہا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا، کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ ایک قربانی کا جانور بھیج دو۔ خانہ کعبہ کو۔ اس نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کھجوروں کی ایک ٹوکری لائی گئی تو آپ نے اس شخص سے کہا، یہ لو اور صدقہ کر دو۔ اس نے کہا کہ میں اپنے سے زیادہ کسی کو بھی اس کا محتاج نہیں پاتا تو آپ نے فرمایا، یہ لے جاؤ اور خود کھالو اور جس غلطی کے مرتکب ہوئے ہو ایک روزہ اس کی جگہ رکھ لو۔

وضاحت: پہلی روایت میں راوی حضرت ابو ہریرہؓ اور اس روایت میں سعید بن المسیب ہیں جو مدینہ کے مشہور فقیہ ہیں۔ سعید بن المسیب تابعی ہیں اور انہوں نے صحابی کا نام نہیں لیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی روایت مرسل ہے۔ لیکن دیکھئے کہ پہلی مرفوع روایت میں دو پہلو چھوٹ گئے ہیں جو یہاں اس مرسل روایت میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ایک ہی واقعہ کو جب دو راوی بیان کرتے ہیں تو کن پہلوؤں کو چھوڑ دینے اور کن پہلوؤں کو لینے کا امکان ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر راوی فقیہ نہ ہو تو وہ ایسی باتیں چھوڑ دیتا ہے جن کا ذکر ضروری تھا۔ لہذا روایات کو ملا کر ان پر غور کرنے سے اصل بات سمجھ میں

آتی ہے۔

پہلی روایت میں راوی نے صرف افطر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی نے ایک گھونٹ پانی نگل لیا اور یہ بھی کہ وہ کسی حرکت مجرمانہ کا مرتکب ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ محض ایک گھونٹ پانی نگلنا کفارہ کا موجب نہیں ہوتا۔

پہلی روایت میں محض یہ بیان ہوا ہے کہ ایک آدمی نے روزہ توڑ دیا جبکہ دوسری روایت میں یہ ہے کہ ایک بدو سینہ پیٹتا، بال نوچتا اور یہ کہتا ہوا آیا کہ یہ محروم القسمت ہلاک ہو گیا، تو یہ ٹھیک تصویر ہے ایک دیہاتی کی جس سے کوئی غلطی صادر ہو گئی ہو اور وہ اس کو بہت بڑا گناہ سمجھتا ہو۔

پہلی روایت میں دو ماہ کے روزے اور ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانے کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری روایت میں بھی یہ ہدایت نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی کفارہ بھی ادا کرنا ہے۔ لیکن جمہور کا مذہب یہ ہے کہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جب استطاعت ہو تو تم یہ کر دینا۔ ایسی بات تو چھوڑی جا سکتی ہے جو متعلق بیان نہ ہو لیکن آنحضرت یہ ضروری بات کیسے چھوڑتے۔ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کی مثال صدقہ فطر کی ہے۔ یعنی ایک شخص کے پاس مال ہے تو صدقہ فطر دے گا اور نہیں ہے تو یہ نہیں کہ صدقہ اس کے ذمہ واجب رہے گا۔ تو معلوم ہوا کہ غریب کے لیے، نادار کے لیے ایک روزہ اس ایک روزہ کی جگہ رکھ لینا ہے جو اس نے توڑا ہے۔ یہ بات کہ استطاعت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آدمی اپنے بارے میں خود کرے گا۔ بہر حال اس روایت کی روشنی میں میرے نزدیک جمہور کا مذہب قوی نہیں ہے کہ کفارہ کب لازم ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے بدل بتا دیا کہ ایک روزہ رکھ لو، یہ نہیں کہا کہ بعد میں استطاعت ہو تو ساٹھ روزے پورے کر دینا۔

یہ بات کہ ان تینوں باتوں میں ترتیب ہے یا نہیں تو یہ بات ثابت کرنا آسان نہیں ہے کہ ترتیب ضروری ہے۔ بہر حال تلافی کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ رہ گیا دو ماہ کے روزے رکھنا یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا اور ایک روزہ رکھ لینا تو اس میں طے کرنا پڑے گا کہ روزہ توڑنے والے کی استطاعت کہاں تک ہے۔

◉ **قال مالک، قال عطاء فسالت سعید بن المسیب کم فی ذالک العرق من تمر، فقال ما بین خمسۃ عشر صاعا الی عشرین۔**

ترجمہ: عطاء کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیب سے پوچھا کہ ایک ٹوکری میں کتنے کھجور ہوتے تھے تو انہوں نے کہا کہ پندرہ سے لے کر بیس صاع تک ہوتے تھے۔ (قریباً ایک من)

◉ **قال مالک سمعت اھل العلم یقولون لیس علی من افطر یوما فی قضاء رمضان باصابۃ اھلہ نھارا او غیر ذالک الکفارۃ التی تذکر عن رسول اللہ فیمن**

اصاب اهله نهارا في رمضان و انما عليه قضاء ذالک اليوم و قال مالک و هذا احب ما سمعت فيه الي.

ترجمہ: امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے اہل علم سے سنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جس نے قضاء رمضان کے سلسلہ میں یا اس کے سوا کوئی اور روزہ اپنی بیوی سے دن میں ملاقات کر کے توڑ دیا تو اس پر وہ کفارہ نہیں ہے جو رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے بارے میں نقل ہوا جو رمضان میں ایسی حرکت کر بیٹھے۔ بلکہ اس کی جگہ پر قضا ہے کہ ایک روزہ رکھ لے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی محبوب ترین رائے ہے جو میں نے سنی ہے۔

وضاحت: اہل علم سے مراد فقہائے مدینہ ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اوپر جو کفارہ بیان ہوا ہے وہ اس شخص سے متعلق ہے جو رمضان میں ایسی حرکت کر بیٹھے۔ لیکن اگر رمضان کے روزے کی قضا رکھ رہا ہو یا دوسرے دنوں میں کوئی روزہ رکھے ہوئے ہو اور اس میں یہ حرکت صادر ہو جائے کہ بیوی سے ملاقات کر بیٹھا تو اس کی جگہ پر ایک روزہ رکھ لے گا۔ امام صاحب کے یہ الفاظ کہ میرے نزدیک یہ محبوب ترین رائے ہے اس بات پر دلیل ہیں کہ اس معاملہ میں اختلاف کی گنجائش ہے، یعنی کوئی اگر مختلف رائے رکھتا ہے تو رکھ سکتا ہے۔

ما جاء في حجامة الصائم

روزہ دار کے پچھنا لگوانے کا کیا حکم ہے

◉ حدثني يحيى عن مالک عن نافع عن عبدالله بن عمرؓ انه كان يحتجم و هو صائم قال ثم ترک ذالک بعد فكان اذا صام لم يحتجم حتى يفطر.

ترجمہ: نافع کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرؓ روزہ رکھے ہوئے پچھنا لگواتے تھے پھر بعد میں انہوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ جب روزہ کی حالت میں ہوتے تو پچھنا نہیں لگواتے تھے۔

وضاحت: حجامت سے مراد پچھنا لگوانا ہے یعنی خون نکلوانا۔ عرب کا ملک گرم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یہ عمل کرتے رہے ہیں کہ کسی رگ میں نشتر لگوا کر خون نکلوا دیا۔ ہم لوگوں کے پاس فالتو خون کہاں، البتہ یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے کہ روزہ کی حالت میں خون دینے کا عمل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس روایت سے پچھنے کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی کی اپنی صوابدید پر ہے۔ جب وہ محسوس کرے کہ خون نکلوانے میں کوئی حرج نہیں، صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تو نکلوا سکتا ہے۔ اب یہی فتویٰ خون دینے کے

بارے میں بھی ہوگا۔ اگر پیسے لے کر کوئی یہ کام کرتا ہے تو جائز نہیں۔ باقی رہ گیا پیسے لیے بغیر کرتا ہے تو روزے میں اور بغیر روزے میں یہ کر سکتا ہے۔ خون دینا اگر زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر ہو تو خون دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس میں ڈاکٹر کی رائے حتمی ماننی پڑے گی۔

◉ و حدثني عن مالک عن ابن شهاب ان سعد بن ابیؓ وقاص و عبدالله بن عمر كانا يحتجمان و هما صائمان.

ترجمہ: ابن شہاب سے روایت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر دونوں روزے کی حالت میں پچھنا لگواتے تھے۔

◉ و حدثني عن مالک عن هشام بن عروة عن ابيه انه كان يحتجم وهو صائم ثم لا يفطر. قال وما رايته احتجم قط الا وهو صائم.

ترجمہ: عروہ کہتے ہیں کہ ان کے والد (زبیر) روزے کی حالت میں پچھنا لگواتے تھے اور اس کی وجہ سے افطار نہیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ روزے کی حالت کے سوا انہوں نے کبھی پچھنا لگوایا ہو۔

وضاحت: حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور زبیر رضی اللہ عنہم تینوں اس امت کے بڑے آدمی ہیں۔ یہ روزے کی حالت میں خون نکلوانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

◉ قال مالک لا تكره الحجامة للصائم الا خشية من ان يضعف و لولا ذلک لم تكره و لو انّ رجلا احتجم في رمضان ثم سلم من ان يفطر لم ار عليه شيئا و لم آمره بالقضاء لذالک اليوم الذي احتجم فيه لان الحجامة انما تكره للصائم لموضع التغرير بالصيام فمن احتجم و سلم من ان يفطر حتى يمسي فلا ارى عليه شيئا و ليس عليه قضاء ذالک اليوم.

ترجمہ: امام مالک کا فتویٰ ہے کہ پچھنا لگوانا روزہ دار کے لیے مکروہ نہیں مگر صرف اس اندیشے سے کہ وہ کمزور ہو جائے گا، اگر یہ بات نہیں تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ اور اگر کوئی آدمی رمضان میں پچھنا لگوائے، پھر روزہ کھولنے سے محفوظ رہے تو میں اس میں کچھ حرج نہیں پاتا۔ میں اس کو اس دن کے روزے کی قضا کرنے کا کہ جس دن اس نے پچھنا لگوایا ہے، حکم نہیں دوں گا۔ کیونکہ پچھنا لگوانا روزہ دار کے لیے مکروہ ہے تو اس وجہ سے کہ کہیں روزہ خطرہ میں نہ پڑ جائے۔ پس جس نے پچھنا لگوایا اور افطار کرنے سے محفوظ رہا

اور شام ہو گئی تو اس کے اوپر کوئی حرج نہیں اور اس دن کی اس میں قضا بھی نہیں۔

وضاحت: امام مالکؒ ایک بہت بڑے امام فقہ ہیں لیکن دیکھ رہے ہیں کہ ان کے کلام میں کتنا طول اور تکرار ہے۔ فتویٰ ان کا صحیح ہے۔

صیام یوم عاشورہ

عاشورہ کے دن کا روزہ رکھنا

◉ حدثنی یحیی عن مالک عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة زوج النبی ﷺ انها قالت کان یوم عاشوراء یوما تصومه قریش فی الجاهلیة و کان رسول الله ﷺ یصومه فی الجاهلیة فلما قدم رسول الله ﷺ المدینة صامه و امر بصیامه. فلما فرض رمضان کان هو الفریضة و ترک یوم عاشوراء فمن شاء صامه، و من شاء ترکه

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ عاشورہ کے دن قریش جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے اور نبی ﷺ بھی اس دور میں روزہ رکھتے تھے۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے خود عاشورہ کا روزہ رکھا اور اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو وہی فریضہ ٹھہرے اور آپ نے یوم عاشورہ کا روزہ چھوڑ دیا۔ پس اب جو چاہے رکھے اور جو چاہے ترک کرے۔

وضاحت: عاشورہ کے دن سے مراد دسویں محرم ہے۔ اس روایت کے مطابق عاشورہ کا روزہ رکھنا جاہلیت کے زمانہ کی چیز ہے۔ جاہلیت کے زمانے سے مراد یہ ہے کہ یہ روزہ اسماعیلی ملت میں اور دین حنیفی کی روایات میں تھا اور آنحضرت ﷺ بھی یہ روزہ رکھتے رہے۔ جاہلیت کے دور میں جن چیزوں کی رسول اللہ ﷺ نے تقلید کی ہے وہ چیزیں وہی ہیں جو کہ دین حنیفی میں تھیں۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ قریش کی طرح مدینہ کے یہود بھی یہ روزہ بڑے اہتمام سے رکھتے تھے۔ اتنی قدیم روایت کے بارے میں یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ اس روزے کا کوئی تعلق حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعات سے ہے۔

چونکہ ماہ رمضان کے روزے فرض ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ نفلی روزہ رکھنا چھوڑ دیا تھا اس لیے اب اگر اس کو کوئی رکھے گا تو یہ قدیم سنت کی پیروی ہوگی۔ میری رائے یہ ہے کہ اب یہ روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب شیعہ حضرات نے اس دن اور اس کے روزے کو اپنے دین کا حصہ بنا لیا ہے۔ لہٰذا اب یہ روزہ رکھنے سے آدمی جتنی نیکی کمائے گا اس سے زیادہ اپنے آپ کو فتنہ میں ڈال دے گا۔

◉ و حدثنی عن مالک عن ابن شهاب عن حمید بن عبدالرحمن بن عوف انه سمع معاویة بن ابی سفیان یوم عاشوراء عام حج و هو علی المنبر یقول یا اهل المدینة این علماء کم سمعت رسول الله ﷺ یقول لهذا الیوم هذا یوم عاشوراء و لم یکتب علیکم صیامه و انا صائم فمن شاء فلیصم و من شاء فلیفطر

ترجمہ: معاویہ بن سفیان نے جس سال حج کیا، عاشورہ کے دن منبر پر کھڑے ہوئے اور کہا کہ اے اہل مدینہ تمہارے علما کہاں ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ اس دن کے بارے میں فرماتے تھے کہ یہ یوم عاشورہ ہے۔ اس کا روزہ رکھنا تم پر فرض نہیں کیا گیا لیکن میں روزے سے ہوں۔ تو تم میں سے جو چاہے روزہ رکھے، جو چاہے نہ رکھے۔

وضاحت: اس روایت میں معاویہ بن ابی سفیانؓ نے علما کو جو تنبیہ کیوں کیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں علما کچھ زیادہ متشدد ہو گئے کہ روزہ رکھنا چاہیے تو انہوں نے پوری روایت بیان کر کے صحیح بات واضح کر دی۔

◉ و حدثنی عن مالک انه بلغه ان عمر بن الخطاب ارسل الی الحارث بن هشام ان غدا یوم عاشوراء فصم و امر اهلک ان یصوموا۔

ترجمہ: امام مالکؒ کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حارث بن ہشام سے کہا کہ کل یوم عاشورہ ہے تو تم روزہ رکھو اور اپنے گھر والوں سے بھی کہو کہ روزہ رکھیں۔

وضاحت: ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک خاص شخص کو حکم دیا ہو کہ نفلی روزہ کی طرح پر عاشورہ کا روزہ رکھو۔

صیام یوم الفطر و الاضحیٰ والدھر

یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ اور تمام عمر کا روزہ

◉ حدثنی یحیی عن مالک عن محمد بن یحیی بن حبان عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ نهی عن صیام یومین یوم الفطر و یوم الاضحی.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دنوں کے روزہ سے منع فرمایا ہے، عید الفطر کے دن کے روزہ سے اور عید الاضحیٰ کے دن کے روزہ سے۔

وضاحت: یہ دو دن خوشی کے دن ہیں، کھانے پینے کے دن ہیں۔ ان دنوں میں روزہ رکھنے کو تقویٰ نہیں سمجھنا چاہیے۔

◉ و حدثنی عن مالک انه سمع اهل علم یقولون لا باس بصیام الدهر اذا افطر الایام التی نهی رسول الله ﷺ عن صیامها و هی ایام منی، و یوم الاضحی، و یوم الفطر فیما بلغنا قال و ذالک احب ما سمعت الی فی ذالک.

ترجمہ: امام مالک کہتے ہیں کہ انہوں نے اہل علم سے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ صیام دہر میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ آدمی ان دنوں میں افطار کرے کہ جن میں رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ یعنی ایام منیٰ، بقرعید کا دن اور عید الفطر کا دن۔

وضاحت: یہاں ایام منیٰ یا ایام تشریق کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ ان کو بھی عیدین پر قیاس کیا جائے گا۔ یہ تمام دن کھانے پینے کے ہیں۔ صیام دہر کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بھر روزے رکھے، سوا ان دنوں کے جن میں افطار کرنے کا حکم ہے۔ یعنی ایام منیٰ اور عیدین کے دن۔ صیام دہر میں کوئی حرج تو نہیں ہے اور اس کو حرام نہیں کہہ سکتے لیکن اصولی طور پر دین کے معاملہ میں تشدد کا راستہ اختیار کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ زندگی کا صحیح نقشہ وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا ہے۔ آپ روزہ بھی رکھتے تھے اور افطار بھی کرتے تھے۔ صیام دہر اس معتدل راستہ کے خلاف ہے۔

النهی عن الوصال فی الصیام

روزے میں روزہ کھولے بغیر دوسرا روزہ رکھنے کی ممانعت

وصال صوم یہ ہے کہ افطار نہیں کیا اور دوسرا روزہ رکھ لیا۔ رمضان میں اس کی ممانعت ہے۔ اور ممانعت اس کی ہمیشہ ہونی چاہیے کیونکہ یہ غلو ہے۔

◉ حدثنی یحیی عن مالک عن نافع عن عبدالله بن عمر ان رسول الله ﷺ نهی عن الوصال، فقالوا یا رسول الله فانک تواصل فقال انی لست کهیئتکم انی أطعم و أسقی.

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صوم وصال سے منع فرمایا تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ خود تو وصال کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا، میں تمہاری مانند نہیں ہوں، مجھے کھلایا اور پلایا

جاتا ہے۔

وضاحت: اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ایک روح کی قوت اور دوسری روح کی طاقت میں بڑا تفاوت ہے۔ ایک روح کی طاقت اور، اور دوسرے شخص کی اور ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اور تھی، دوسروں کی اور ہے۔ کھلانے پلانے کا مطلب اگر یہ ہیں کہ جنتی پھل، انگور، سیب وغیرہ حضور کو کھانے کو ملتے تھے تو ظاہر ہے کہ یہ روزہ وصال تو نہیں ہوا۔ صوم وصال کا مطلب ہی یہ ہے کہ بغیر افطار کیے، بغیر کچھ کھائے پیئے دوسرا روزہ رکھ لیا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ روح کی غذا مراد ہے۔ گویا آپ نے فرمایا کہ مجھ پر فیوض الٰہی کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ میں پیاس اور بھوک سے مستغنی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں کہ برداشت کروں۔ حدیث کا یہی مطلب ہے اور یہی مطلب صحیح ہے۔ باقی اور جو مطلب بیان کیے جاتے ہیں وہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔

◉ و حدثنی عن مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال: ایاکم والوصال ایاکم والوصال قالوا فانک تواصل یا رسول الله. قال انی لست کهیئتکم انی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، لوگو بچو وصال سے، لوگو بچو وصال سے تو لوگوں نے کہا، یا رسول اللہ آپ بھی تو روزہ وصال کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں، میں اپنے رب کے قرب میں رات گزارتا ہوں اور میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

وضاحت: روایتوں کا فرق دیکھئے۔ پہلی روایت کے الفاظ مبہم ہیں اور اس روایت کے زیادہ واضح ہیں۔ راوی اور راوی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جو تجلیات طاری ہوتی تھیں وہ ہر ایک کو نصیب نہیں۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں میری پیروی نہ کرو۔ دو مرتبہ آپ نے فرمایا کہ بچو روزہ کے وصال سے۔ مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس نیکی میں اپنی صحتیں کھو بیٹھو۔

صیام الذی یقتل خطأ او یتظاهر

اس شخص کے روزے جو قتل خطا یا ظہار کی وجہ سے رکھ رہا ہو

مطلب یہ ہے کہ کیا ان روزوں میں تسلسل رکھنا ہوگا، بیچ میں ناغہ نہیں کریں گے اور اگر ناغہ کریں گے تو کیا ہوگا، پچھلے روزوں کے ساتھ جوڑ کر گنتی پوری کریں گے یا از سر نو رکھیں گے۔

حدثني يحيى سمعت مالكا يقول: احسن ما سمعت فيمن وجب عليه صيام شهرين متتابعين في قتل خطاء او تظاهر فعرض له مرض يغلبه و يقطع عليه صيامه انه ان صح من مرضه و قوى على الصيام فليس له ان يوخر ذالك و هو يبنى على ما قد مضى من صيامه و كذالك المراة التي يجب عليها الصيام في قتل النفس خطاء اذا حاضت بين ظهرى صيامها انها اذا طهرت لا توخر الصيام و هي تبنى على ما قد صامت و ليس لاحد وجب عليه صيام شهرين متتابعين في كتاب الله ان يفطر الا من علة مرض او حيض و ليس له ان يسافر فيفطر. قال مالك و هذا احسن ما سمعت.

ترجمہ: یحییٰ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو کہتے سنا ہے کہ بہترین رائے، جو میں نے اس شخص کے بارے میں سنی ہے جس پر دو مہینے کے متواتر روزے قتل خطا یا ظہار کی وجہ سے رکھنے ہوں، یہ ہے کہ اس شخص پر اگر کوئی مرض غالب ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے روزوں کو منقطع کر دیتا ہے تو جب وہ بیماری سے تندرست ہو اور قوت رکھے روزے کی تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کو موخر کرے بلکہ وہ انہی روزوں پر بنا رکھے کہ جو روزے وہ بیماری سے پہلے رکھ چکا ہے۔ اسی طریقے سے ایک عورت جس کے اوپر قتل خطا کے سلسلہ میں روزے واجب ہیں اور اس کو روزوں کے درمیان حیض کی حالت پیش آ جائے تو جب وہ طہر میں آئے گی تو اپنے روزے کو موخر نہیں کرے گی بلکہ اسی پر اپنی بنا رکھ کر روزے پورے کرے گی۔ اور کسی پر بھی دو مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت واجب ہوں تو وہ افطار کر سکتا ہے، بشرطیکہ علت مرض یا فطری ضرورت ہو۔ یہ نہیں کہ وہ مصنوعی طور پر سفر اختیار کرے اور افطار کرے۔ میرے نزدیک یہی رائے بہترین ہے جو میں نے سنی۔

وضاحت: یہ امام مالک کے فتوے ہیں اور ٹھیک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے آسانی پیدا کی۔

ما یفعل المریض فی صیامه

کوئی مریض ہو تو روزے کے معاملہ میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے

قال يحيى سمعت مالكا يقول الامر الذي سمعت من اهل العلم ان المريض اذا اصابه المرض الذي يشق عليه الصيام معه و يتعبه و يبلغ ذالك منه، فان له ان يفطر و كذالك المريض الذي يشتد عليه القيام في الصلاة و بلغ منه و ما الله اعلم

بعذر ذالك من العبد، و من ذالك مالا تبلغ صفته فاذا بلغ ذالك صلى و هو جالس و دين الله يسر و قد ارخص الله للمسافر في الفطر في السفر و هو اقوى على الصيام من المريض. قال الله تعالى في كتابه: فمن كان منكم مريضا او على سفر فعدة من ايام اخر. فارخص الله للمسافر في الفطر في السفر وهو اقوى على الصوم من المريض فهذا احب ما سمعت الي و هو الامر المجتمع عليه.

ترجمہ: امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے اہل علم سے سنا ہے کہ مریض، جس کو ایسا مرض لاحق ہو کہ اس کے باعث اس پر روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ اس کو تھکا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ روزہ توڑ دے۔ اور اسی طریقہ سے جس مریض کو نماز میں قیام شاق ہو اور وہ اس پر اثر انداز ہو گیا ہو اس حد تک جس کو اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اس بندے کے لیے عذر بن سکتا ہے اور اس کو بھی وہ خوب جانتا ہے جو اس حد کو نہیں پہنچا، تو جو اس حد کو پہنچ جائے تو اس کو چاہیے کہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔ اللہ کا دین آسان ہے اور اللہ نے خود مسافر کو سفر میں روزہ چھوڑنے کی رخصت دے دی ہے، حالانکہ وہ روزہ پر مریض کے مقابل میں قوی تر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اپنی کتاب میں یہ ہے کہ جو تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے مسافر کو سفر میں افطار کی اجازت دی ہے حالانکہ وہ روزہ کے معاملہ میں مریض سے قوی تر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ مسلک محبوب تر ہے اور یہ متفقہ مسئلہ ہے۔

وضاحت: و یبلغ ذالک منه، یہ عربی کا محاورہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اس پر گہرے طور پر اثر انداز ہو۔ و بلغ منه و ما الله اعلم بعذر ذالک من العبد، و من ذالک مالا تبلغ صفته ظاہر ہے کہ یہ فقرہ جملہ معترضہ کی جگہ پر ہے۔ لیکن اس میں جو 'و' ہے 'وما الله اعلم' کی جگہ پر اس کو شارح حضرات زائد کہتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ راوی کا سہو ہے اس لیے کہ زائد عربیت کے قاعدہ کے اندر ہوتا ہے اور ایک ضابطہ کے تحت آتا ہے۔ چونکہ معاملہ روایت کا ہے تو ان لوگوں نے یہ نہیں کہا کہ راوی کا سہو ہے۔ اب یہ تو پتہ چلتا ہے کہ روایت کے معاملہ میں احتیاط تو بہت کرتے ہیں لیکن غلط روایت کو بھی لیے چلے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے ہاں اس 'و' کو اڑا دیا اس لیے کہ اس کو ماننے کے بعد مطلب نہیں بنتا تھا۔ لیکن یہ انہوں نے بھی نہیں کہا کہ یہ سہو ہے۔ 'و' کو اسقاط کرنے کے بعد جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اور وہ (مرض) اثر کر جاتے اس کے اندر اس حد تک جس کو اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اس بندے کے لیے عذر بن سکتا ہے۔ یعنی اب یہ معاملہ آدمی کی اپنی صوابدید پر ہے، فیصلہ مریض کا اپنا ہوگا۔ مالا تبلغ صفته ہوتا ہے۔ یہاں ضبط ہے صِفَتُهُ۔ اس کا حوالہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اختیار ہے [illegible]

اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس کا مرض عذر کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں۔ فاذا بلغ ذالک ۔اس حد کو پہنچ جائے تو اس کو چاہیے کہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔ اللہ کا دین آسان ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مریض کو روزہ چھوڑنا ہو یا بیٹھ کر نماز پڑھنا ہو تو فیصلہ مریض کا اپنا ہوگا کہ کب وہ اس حد کو پہنچ گیا ہے۔ اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر اگر یہ کہہ دے کہ روزہ مضر ہے تو مریض کو اس کا مشورہ ماننا چاہیے۔ اس لیے کہ مرض کے جن پہلوؤں کو ڈاکٹر سمجھ سکتا ہے مریض بسا اوقات اس کا اندازہ نہیں کر پاتا۔ لیکن بہر حال اس معاملہ میں شریعت کوئی حد مقرر نہیں کرتی۔ یہ آدمی کا اپنا احساس ہے جو فیصلہ کرے گا۔

امام مالک کہتے ہیں کہ یہی مسلک میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی کی رائے اس سے الگ ہے تو وہ رائے قائم کر سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اجتہادی معاملہ میں اس سے زیادہ اصرار نہیں ہونا چاہیے۔ عندی هکذا ، والعلم عندالله ۔یہ دینہ زیادہ بہتر ہے۔ هوالامر المجتمع علیه یعنی مدینہ کے اہل علم اس پر متفق ہیں۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

بقیہ درس بخاری از صفحہ ۱۴

اب ایک صورت یہ ہے کہ اگر کل باغ کا نقصان ہو گیا ہے تو اس صورت میں کیا ہوگا۔ تو ایک گروہ کہتا ہے کہ بیع فسخ کر دی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اگر قبضہ ہو گیا تھا تو مشتری نقصان برداشت کرے گا اور اگر قبضہ نہیں ہوا تھا تو بائع اس کا ذمہ دار ہوگا۔ اول تو یہ فرضی صورت ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ باغ کلیۃً تباہ ہو جائے۔ یہ عام تباہی کی شکل میں ہوتا ہے تو ایسی صورت میں حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ رعایا کے نقصان کی تلافی کرے۔ میری رائے یہ ہے کہ عام تباہی کی صورت میں شہریوں کی مدد افراد کی ذمہ داری نہیں بلکہ حکومت کی ذمہ داری ہوگی۔

روایت میں ابن شہاب کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ایک شخص باغ خریدے جب کہ اس کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی ہو پھر اس پر آفت آ جائے تو اس کا ذمہ دار باغ کا مالک ہوگا۔ انہوں نے اس کے لیے حوالہ ابن عمر کی جس روایت کا دیا ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ابن عمر کی روایت سے کس طرح سے ابن شہاب کا فتویٰ نکلتا ہے۔

خالد مسعود

مخاطب کو متوجہ اور متنبہ کرنے والے اسالیب

قرآن مجید میں متعدد ایسے اسالیب کلام اختیار کیے گئے ہیں جو مخاطب کو کسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے، اس کو جھنجھوڑنے اور ضد چھوڑ کر اصل حقائق کا مواجہہ کرنے کی دعوت دینے کے لیے ہیں۔ ان میں سے بعض نمایاں اسالیب کا تذکرہ ہم یہاں کرتے ہیں۔

ا۔ تنہا مبتدا کا استعمال:

عام حالات میں کوئی بھی بامعنی کلام مبتدا اور خبر دونوں کے جمع ہونے سے بنتا ہے۔ مثلاً سلیم بیمار ہے یا طالب علم پڑھ رہا ہے۔ ان جملوں میں تنہا 'سلیم' یا 'طالب علم' کہنے سے پتہ نہیں چلے گا کہ بات کرنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ضروری ہوتا ہے کہ مخاطب کی پوری توجہ مبتدا پر مرکوز ہو جائے۔ متکلم اگر خبر بتانے میں لگ جائے تو مخاطب کی توجہ منتشر ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی دوست کے ہمراہ جا رہے ہوں اور دوست کے سامنے یکایک ایک سانپ نمودار ہو جائے تو آپ اس کو متنبہ کرنے کے لیے محض "سانپ!" کہہ دیں گے۔ یہ نہیں کہیں گے کہ آپ کے آگے سانپ بیٹھا ہے۔ کیونکہ آپ کا جملہ پورا ہونے سے قبل سانپ اپنا کام کرے گا اور جس خطرہ سے دوست کو بچانا چاہتے تھے اس سے آپ اسے دوچار کر دیں گے۔

قرآن مجید کی سورتوں کے جو نام حروف مقطعات کی صورت میں آئے ہیں وہ اصل میں مبتدا ہیں اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اگلا جملہ ان کی خبر بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ گویا متکلم کا اصل زور مبتدا ہی پر ہے اور مقصد اس سورہ کے مضامین کی طرف مخاطب کی کامل توجہ کو مبذول کرانا ہے۔

سورہ الحاقہ اور سورہ القارعہ کا آغاز بھی تنہا مبتدا کے ذکر سے ہوا ہے۔ یعنی الحاقه اور القارعة ۔ یہ الفاظ وقوع عذاب اور وقوع قیامت کے لیے آئے ہیں۔ خود ان الفاظ میں بھی وحشت اور ہولناکی کا مفہوم موجود ہے جو مخاطب کی توجہ کو جذب کرتا ہے۔ الحاقه، یعنی ایک اٹل اور قطعی چیز جو حقیقت بن کر سامنے آنے والی ہے۔ القارعه، یعنی ٹھونکنے اور کھٹکھٹانے والی آفت۔ جس طرح رات میں آنے والا زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا دے اور گھر والے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اسی طرح قیامت کی گھڑی اچانک نمودار ہوگی اور سارے عالم میں اس سے ایک ہلچل مچ جائے گی۔ گویا اس مبتدا کو ان الفاظ میں سن کر ہی

مخاطب متوجہ ہو جائے گا کہ متکلم کس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کیفیت کو مزید پر اثر بنانے کے لیے ان سورتوں میں مبتدا کے بعد ایک سوالیہ جملہ کا اضافہ کیا ہے۔ ما الحاقة (کیا ہے الحاقہ؟) ما القارعة (کیا ہے کھڑکھڑانے والی؟) چونکہ سوال کرنے سے بھی وہ شخص چونکنا ہو جاتا ہے جس سے سوال کیا جائے، اس لیے اس سوالیہ جملہ کا مقصد مبتدا کی خبر سنانے سے پہلے مخاطب کو مزید متوجہ کرنا ہے تاکہ وہ غفلت اور بے پروائی کے ساتھ نہیں بلکہ کان کھول کر بات کو سنے۔

یہی اسلوب کلام اس صورت واقعہ یا کیفیت کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو مخاطب کے لیے اجنبی، اس کے قیاس و گمان سے مافوق اور الفاظ کی گرفت میں نہ آنے والی ہو۔ ایسی صورت واقعہ وہ بھی ہوتی ہے جب کسی چیز کی شان وعظمت بیان نہ ہو پا رہی ہو اور اس کے برعکس وہ کیفیت بھی جس کی دنا کی، شدت اور اس سے دوچار لوگوں کی ذلت و بدحالی کی تصویر الفاظ کی مدد سے کھینچنا ممکن نہ ہو رہا ہو۔ قرآن مجید نے ایسے دونوں مواقع پر یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔ فرمایا:

فاصحٰب المیمنة ما اصحاب المیمنة و اصحاب المشئمة ما اصحاب المشئمة

(داہنے والے؟ تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! اور بائیں والے؟ تو کیا حال ہو گا بائیں والوں کا!)

یعنی داہنے والوں کی عظمت و شان، عیش جاوداں اور خوش انجامی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ رہ گئے بائیں والے، تو ان کی ذلت ونکبت، بدبختی اور بدانجامی کا پتہ نہ پوچھو، یہ الفاظ کے احاطہ میں نہیں آ سکتی۔ اس کا اندازہ وہی کو ہو گا جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔

۲۔ ما ادراک کا استعمال:

ما ادراک کا مفہوم یہ ہے کہ فلاں چیز کیا ہے اور کیسی ہے تم کیا جانو، اور کون تمہیں اس وقت اس کی حقیقت سے مطلع کر سکتا ہے۔ یہ اسلوب بھی کسی ایسی چیز کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے آتا ہے جس کی طرف سے مخاطب اپنی نادانی، کم علمی یا غفلت کے باعث آنکھیں بند کیے ہوئے ہو۔

عالم غیب کے امور سے، خواہ ان کا تعلق اس دنیا سے ہو یا اگلی دنیا سے، اسی اسلوب سے آگاہ کیا گیا ہے اور مخاطبین کو ان کی حقیقت کا ہلکا سا تصور دیا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(i) کَلَّا لَیُنۡبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَةِ وما ادرٰک مَاالۡحُطَمَةُ نَارُاللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ علی الۡاَفۡـِٕدَةِ (الھمزۃ: ۴۔۷)

(ہرگز نہیں، وہ چور چور کر دینے والی میں ضرور پھینکا جائے گا۔ اور تم کیا سمجھے کہ وہ چور چور کر دینے والی کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں پر جا چڑھے گی۔)

(ii) وما ادرٰک مَاالۡقَارِعَةُ یَوۡمَ یَکُوۡنُ النَّاسُ کَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ وَتَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ (القارعہ ۳۔۵)

(اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھڑکھڑانے والی؟ اس دن لوگ منتشر پتنگوں کے مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے)

(iii) کَلَّا اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ وَمَا اَدۡرٰکَ مَا سِجِّیۡنٌ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ (المطففین ۷۔۱۰)

(ہرگز نہیں، بے شک فاجروں کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر۔ اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کی)

یعنی فاجروں کے عمل کا تمام ریکارڈ ایک ایسی کتاب میں تحریری صورت میں موجود ہو گا جس کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا کہ کون دوزخ کے کس طبقہ میں داخل کیے جانے کا حق دار ہے۔ ان حقائق کو جھٹلانے والے اس دن طرح طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہوں گے۔

(iv) کَلَّاۤ اِنَّ کِتٰبَ الۡاَبۡرَارِ لَفِیۡ عِلِّیِّیۡنَ وَمَاۤ اَدۡرٰکَ مَا عِلِّیُّوۡنَ کِتٰبٌ مَّرۡقُوۡمٌ یَّشۡهَدُهُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ (المطففین: ۱۸۔۲۱)

(ہرگز نہیں، بے شک اچھوں کے اعمال نامے علیین میں ہوں گے اور تم کیا سمجھے کہ علیین کیا ہے۔ لکھا ہوا دفتر مقربوں کی نگرانی میں)

یعنی علیین میں عالی مقام لوگوں کے اعمال نامے ہوں گے جن میں ان کے کارنامے درج ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب فرشتے ان کی نگرانی پر مقرر ہیں۔

(v) سَاُصۡلِیۡهِ سَقَرَ وَمَاۤ اَدۡرٰکَ مَا سَقَرُ لَا تُبۡقِیۡ وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلۡبَشَرِ عَلَیۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ (المدثر: ۲۶۔۳۰)

(میں اس کو عنقریب سقر میں داخل کروں گا، اور کیا سمجھے کہ یہ سقر کیا ہے۔ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چمڑی کو جھلس دینے والی۔ اس پر انیس فرشتے مقرر ہوں گے۔)

ان آیات سے پہلے قرآن کو جادو قرار دینے اور اسے انسانی کلام سمجھنے والوں کا ذکر ہے۔ بتایا ہے کہ ان کا ٹھکانا سقر ہو گی جو ایسی آگ ہو گی جس کی لپیٹ چمڑی کو جھلس دے گی اور جو کسی مجرم

پر ترس نہیں کھائے گی۔

(vi) وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْحَاقَّةُ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ ' بِالْقَارِعَةِ (الحاقہ: ۳۔۴)

(اورتم کیا جانو کہ کیا ہے اٹل حقیقت؟ ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی آفت کو جھٹلایا ......)

مطلب یہ ہے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر آنے والا عذاب ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی ہولناکی، ہمہ گیر آفت اور بے پناہ مصیبت کو بیان کرنا کس کے بس میں ہے؟ آگے عاد، ثمود اور دوسری اقوام کی مثالوں سے سمجھایا ہے کہ تکذیب کے نتیجہ میں وہ جس مصیبت سے دوچار ہوئیں اس کی نوعیت کیا تھی۔

(vii) وَمَا اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ثُمَّ مَا اَدْرٰکَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ ' لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ. (انفطار: ۱۷۔۱۹)

(اورتم کیا سمجھے جزا کے دن کو؟ پھر، تم کیا سمجھے جزا کے دن کو؟ اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لیے کچھ نہ کر سکے گی اور معاملہ اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا)

یہاں وہی اسلوب دہرایا گیا ہے جس کا مقصد مضمون کی اہمیت کو نمایاں کرنا ہے۔ مخاطب کو پوری طرح متوجہ کرنے کے بعد روز جزا کی اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ وہاں کوئی کسی دوسرے کے کام نہ آسکے گا۔ تمام مزعومہ شرکاء وشفعاء بے بس ہوں گے۔ فیصلہ کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہوگا۔

(viii) اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَا اَدْرٰکَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ ' مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ. (القدر: ۱۔۳)

(بے شک ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا، اور تم کیا جانو شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔)

یہاں اس رات کی عظمتوں اور برکتوں کا حوالہ دیا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔ بتایا ہے کہ اس رات میں پوری کائنات کے لیے اللہ تعالیٰ کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اس ایک رات کی برکات پر دوسری ہزار مہینوں کی راتیں فوقیت نہیں پاسکتیں۔ لوگ اس رات کی اہمیت کیا جانیں!

(ix) فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ ' فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد: ۱۱۔۱۶)

(پر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی؟ گردن کو چھڑانا یا بھوک کے

زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلانا!)

یہاں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں، بولنے کے لیے زبان اور ہونٹ عطا فرمائے، پھر اس کو ہدایت کی روشنی عطا کی۔ ان عنایات کا حق یہ تھا کہ یہ گھاٹی عبور کر کے اپنی شکرگزاری کا ثبوت مہیا کرتا لیکن افسوس، اس نے یہ حوصلہ نہیں دکھایا۔ اس کے بعد جس گھاٹی کے عبور کرنے کا اس سے مطالبہ کیا ہے اس کو مبہم نہیں رہنے دیا، بلکہ یہ بتایا کہ اس سے مراد ہمدردی، خلق، ایثار اور نیکی کے کام ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وضاحت کے بغیر آدمی کے لیے یہ جاننا مشکل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے۔

(x) وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (الطارق: ۱۔۳)

(شاہد ہیں آسمان اور رات میں نمودار ہونے والے۔ اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہیں رات میں نمودار ہونے والے۔ دہکتے ستارے!)

یعنی رات میں نمودار ہونے والے بھی اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے۔ پھر کہا ہے کہ اس شہادت کو معمولی نہ سمجھو۔ نمودار ہونے والوں سے مراد دہکتے ستارے ہیں یہ خدا کی بنائی ہوئی وہ ان گنت آنکھیں ہیں جو ہر آن اہل زمین کو گھورتی رہتی ہیں۔

۳۔ اَرَاَیتَ کا استعمال:

ارایت کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے جہاں کسی شخص کی نہایت نامناسب حرکت اور برے کردار کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانی اور اس پر نکیر کرنی ہو۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(i) اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الماعون: ۱۔۳)

(دیکھا تم نے اس کو جو جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا اور مسکینوں کو کھلانے پر نہیں ابھارتا)

یہ اشارہ ابولہب کی طرف ہے جو آنحضرتؐ کی بعثت کے زمانہ میں خانہ کعبہ کا کلید بردار اور متولی تھا۔ منصب رفادہ پر فائز ہونے کی بدولت اس نے مال و دولت کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا۔ رفادہ کی ذمہ داریوں کے تقاضوں کے برعکس نہ یتیموں کی سرپرستی کرتا اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر کچھ خرچ کرتا۔ آخرت کی بازپرس سے اس کی بے نیازی نے خانہ کعبہ کے مقاصد کو

بے حد نقصان پہنچایا۔ یہاں اس کے برے کردار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(ii) ارایت الذی ینھی عبدًا اذا صلّٰی ارایت ان کان علی الھدی او امر بالتقوی ارایت ان کذّب وتولّٰی الم یعلم بانّ اللّٰہ یری (العلق ۹۔۱۴)

(ذرا دیکھو تو اس کو جو روکتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا دیکھو تو اگر وہ ہدایت پر ہوا یا نیکی کی تلقین کرنے والا ہوا! بھلا دیکھو تو اگر اس نے جھٹلایا اور منہ موڑا! کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟)

یہاں لہجہ نہایت غضب آلود ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے رسول کے مخاطبوں کی حرکتیں بالکل مجنونانہ ہیں۔ یہ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو نماز ادا کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ سوچتے نہیں کہ یہ اللہ کا بندہ اگر ہدایت پر ہو اور نیکی اور تقویٰ کی راہ لوگوں کو دکھانا چاہتا ہو اور اس کے برعکس خود یہ لوگ اس کی دعوت میں اڑنگے ڈالنے والے اور حق سے منہ موڑنے والے ثابت ہوں، تب ان کی حرکتوں کا انجام کیا ہوگا؟

(iii) افرایت من اتخذ الٰھہٗ ھوٰہ واضلّہ اللّٰہ علی علم و ختم علی سمعہ وقلبہ وجعل علی بصرہ غشوۃ فمن یھدیہ من بعد اللّٰہ افلا تذکّرون (الجاثیہ۔۲۳)

(کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور جس کو اللہ نے علم رکھتے ہوئے، گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا؟ بھلا ایسوں کو کون ہدایت دے سکتا ہے، بعد اس کے کہ اللہ نے ان کو گمراہ کر دیا ہو۔ کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟)

یہاں ارایت کا استعمال یہ دکھانے کے لیے ہوا ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے اپنے عمل کی باگ اپنی خواہش کے ہاتھ میں تھما دی ہو، پھر اس نے اپنے آپ کو ہدایت کی توفیق سے محروم کر لیا ہو اور اللہ نے اس کی سمع و بصر اور عقل و فہم کی صلاحیتوں کو معطل کر کے ان پر مہر کر دی ہو، وہ اب کیسے ہدایت پا سکتا ہے۔ جو لوگ اس کے ایمان کی توقع رکھتے ہیں وہ غور کریں تو ایک ناممکن الحصول مقصد کو حاصل کرنے کے درپے ہیں۔

(iv) افرایت الذی کفر باٰیٰتنا وقال لاُوتینّ مالًا وولدًا اطّلع الغیب ام اتخذ عند الرّحمٰن عھدًا (مریم: ۷۷۔۷۸)

(بھلا دیکھا تم نے اس کو جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ میں آخرت میں بھی

مال اور اولاد سے نوازا جاؤں گا۔ کیا اس نے غیب میں جھانک کر دیکھ لیا ہے یا خدائے رحمان سے کوئی عہد کرا لیا ہے؟)

یہاں ارایت کا استعمال ایک غلط موقف کو بلا کسی دلیل اور بنیاد کے اختیار کرنے والے کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہوا ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ جب دنیا میں آسودہ حال ہوتے ہیں تو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اس خوشحالی اور رفاہیت کے پیدائشی حق دار ہیں۔ ان کے نزدیک اول تو آخرت ہوگی نہیں، اگر ہوئی تو وہاں بھی ان کا مقدر یہی آسودگی اور عیش کی زندگی ہوگی۔ فرمایا کہ یہ لوگ کیا اگلی زندگی میں جھانک آئے ہیں یا اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے جس کے بل بوتے پر اپنی خوش انجامی کا زعم رکھتے ہیں۔

(v) قال ارایت اذ اوینا الی الصّخرۃ فانّی نسیت الحوت وما انسٰنیہ الّا الشّیطٰن ان اذکرہٗ واتخذ سبیلہٗ فی البحر عجبًا (کہف: ۶۳)

(اس نے کہا: جی دیکھیے نا! جب ہم نے چٹان کے پاس پناہ لی تو میں مچھلی کو بھول گیا اور یہ شیطان ہی تھا جس نے اس کو یاد رکھنے سے مجھے غافل کر دیا۔ اور اس نے عجیب طرح اپنی راہ دریا میں نکال لی)

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر کے دوران میں پیش آیا جو انہوں نے خضرؑ سے ملاقات کی غرض سے کیا تھا۔ حضرت موسیٰ کے ہمراہ ان کے شاگرد تھے جن کی حفاظت میں زادِ راہ تھا۔ اس میں ناشتہ کے لیے ایک مچھلی بھی تھی۔ جب وہ سمندر کے کنارے کسی چٹان کے پاس ستانے کے لیے اترے تو مچھلی ناقابلِ یقین طور پر سمندر میں چلی گئی۔ بعد میں جب حضرت موسیٰ نے کھانا مانگا تو شاگرد نے ڈرتے ہوئے ان کو اس عجیب واقعہ کی اطلاع دی۔ یہاں ارایت کا استعمال ایک ناقابلِ یقین واقعہ کی خبر دینے کے لیے ہوا ہے۔

ارایت کے استعمال میں یہ نوع بھی ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ضمیر خطاب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مقصد اس سے بھی کسی خاص پہلو کی طرف توجہ دلانا اور غور کی دعوت دینا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آدم اور ابلیس کے قصہ میں ابلیس کا قول نقل ہوا ہے:

قال ارءیتک ھٰذا الّذی کرّمت علیّ لئن اخّرتن الی یوم القیٰمۃ لاحتنکنّ ذرّیّتہٗ الّا قلیلًا (بنی اسرائیل: ۶۲)

(اس نے کہا: ذرا دیکھ تو اس کو جس کو تو نے مجھ پر عزت بخشی ہے۔ اگر تو نے مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے دی تو میں ایک قلیل تعداد کے سوا اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا)

یعنی تو نے آدم خاکی کو مجھ پر فضیلت دی ہے تو اس کی تخلیق کی بنیاد میں جو کمزوریاں ہیں اگر مجھے ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے تو میں ثابت کردوں گا کہ یہ اس شرف کے لائق نہ تھا جو اس کو عطا کیا گیا۔ اور میں اس کی کثیر ذریت کو گمراہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ ابلیس نے یہاں طنزیہ لہجے میں بات کی ہے اور آدم کی تحقیر کا انداز اختیار کرتے ہوئے اس کی ان کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ اولادِ آدم کو ورغلا سکتا ہے۔

۴۔ ترجیع کا استعمال:

ترجیع سے مراد کسی کلام کا وقفہ وقفہ سے دوہرانا ہے۔ قرآن مجید کی چند سورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی آیت بار بار سامنے آتی ہے اور ایک حقیقت کو وقفوں سے مخاطبین کو سناتی ہے تا کہ ان کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہوئی ہے وہ اس کو کھولیں اور اس حقیقت کا مشاہدہ کریں، اس پر غور کریں اور اس کی روشنی میں اپنے غلط موقف کی اصلاح کریں۔ ترجیع کا اسلوب سورہ الرحمٰن میں اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ ہر پڑھنے والا جانتا ہے کہ آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ہر دو تین آیتوں کے بعد اس میں ٹیپ کے بند کی طرح آتی ہے۔ لیکن ترجیع الرحمٰن کے علاوہ سورہ الشعراء، سورہ القمر اور سورہ المرسلات میں بھی ہے۔

ان تمام سورتوں میں خطاب قریش کے ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو واضح حقیقتوں کو تسلیم کرنے میں اپنی سبکی محسوس کرتے تھے۔ ان کی انانیت حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ ایسے لوگوں کے سامنے اپنی بات مدلل طور پر کہہ دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ ہر دلیل کے بعد ان کو جھنجوڑ دیا جائے کہ یہ بات یا یہ دلیل تمہاری سمجھ میں آئی یا نہیں۔ اگر مخاطبوں کی ضد اور ان کی مزاجی خصوصیت کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ان کو تنبہ نہیں ہوتا اور کلام ان پر بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ لہذا بلاغت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترجیع کا اسلوب اختیار کیا جائے تا کہ یہ لوگ اپنے کان اور آنکھیں کھولیں اور دل و دماغ کو قبول حق کے لیے وا کریں۔

آیت کی ترجیع کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ کلام کے سیاق و سباق سے ہٹ کر آجاتی ہو اور محض تکرار کا فائدہ دیتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نپے تلے الفاظ پر مشتمل اور جامع مضمون کی حامل ہوتی ہے جن کا مدعا بالکل واضح ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے ماسبق کلام کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے جو اس کلام پر غور کر کے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ سورہ رحمان اور سورہ المرسلات میں جو آیات ترجیع ہیں ان کے الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ یہ مختلف انواع کے کلام کے ساتھ مربوط ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

(i) سورہ الشعرا

اس سورہ کا پیغام یہ ہے کہ محمد رسول اللہ، اللہ کے سچے رسول اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ قرآن کو کہانت یا شاعری سمجھ کر رسول کی تکذیب کرنے والے اس عذاب کی نشانی مانگتے ہیں جس کی خبر رسول اللہ ان کو دے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آخر وہ نشانیاں کیوں نظر نہیں آتیں جن سے زمین کا چپہ چپہ معمور ہے۔ اگر ان پر دھیان نہیں دینا چاہتے تو ماضی کی ان اقوام کی تاریخ میں نشانیاں تلاش کریں جو خدا کے تازیانہ عذاب کے نتیجہ میں دنیا سے معدوم ہو گئیں۔ ان ضدی لوگوں پر بھی اگر اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرنا چاہے تو کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہ سکے گا۔ خدا بڑا زبردست ہے۔ لیکن چونکہ وہ بڑا رحیم بھی ہے اس لیے وہ مہلت دیتا ہے تا کہ لوگ توبہ و اصلاح کے بعد اس کی رحمت کے مستحق ہو سکیں۔

زمین کی نشانیوں اور تاریخ میں رسولوں کے واقعات بیان کرتے کرتے جابجا آیت ترجیع آتی ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (اس میں بے شک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی)

(ii) سورہ القمر

اس سورہ میں بھی مخاطب وہی لوگ ہیں جو رسول اللہ کے انذار کے جواب میں نشانی عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کو بتایا ہے کہ ان کے حق میں بہتر یہ ہے کہ تاریخ سے سبق حاصل کریں اور اس انتظار میں نہ رہیں کہ جب سب کچھ ان کے اپنے سروں پر سے گزر جائے گا تب مانیں گے۔ اس قوم پر تو اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم احسان فرمایا ہے کہ ایک ایسی کتاب اتار دی جو تعلیم و تذکیر اور شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع و کامل اور تمام ضروری اوصاف و محاسن سے آراستہ ہے۔ آخر اس عظیم نعمت سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے؟

سورہ میں پچھلی اقوام کی سرگزشتیں سنائی ہیں اور ٹیپ کے بند کے طور پر یہ آیت ترجیع آتی ہے۔ فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَ نُذُرِ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (تو کیسے پیش آیا میرا عذاب اور میرا ڈراوا۔ اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے، تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا؟)

(iii) سورہ الرحمٰن

سورہ رحمٰن میں سورہ القمر کے مضمون کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمان ہے۔ رحمانیت کے تقاضے سے اس نے انسان کو نطق و بیان کی صلاحیت دی جس کے طفیل تم بات سمجھ سکتے اور سمجھا سکتے ہو۔ رحمانیت کے تقاضا ہی سے اس نے قرآن کو رہنمائی کا ذریعہ بنایا اور اصل حقائق کے حق میں دلائل آفاق و انفس میں ہر چہار سو پھیلا دیے۔ لیکن تم ہو کہ پھر بھی نئی نشانیوں کا تقاضا کرتے ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت و قدرت اور اس کی شانوں، کرشموں اور عظیم الشان نشانیوں میں سے ایک ایک پر جیسے انگلی رکھ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں تو اور کیا ہیں۔ ان کی طرف سے کیوں آنکھیں بند کیے ہوئے ہو! ہر نشانی کے بعد آیت ترجیع آتی ہے: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے)

آیت میں آلاء کا لفظ ایسا جامع استعمال ہوا ہے جو نشانیوں، قدرتوں، شانوں، عظمتوں، کرشموں اور کارناموں سب پر حاوی ہے۔ ماسبق آیت کی روشنی میں اس کا خاص پہلو متعین کیا جا سکتا ہے۔

(iv) سورہ المرسلات

اس سورہ میں قیامت کا اثبات آفاق کے آثار و شواہد کی مدد سے کیا ہے اور عدل و جزا کا انکار کرنے والوں کی بدانجامی کی خبر دی گئی ہے۔ سورہ میں زیادہ زور ترہیب کے پہلو پر ہے اور مکذبین کے عذاب کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہر حقیقت کے بیان کے بعد آیت ترجیع آتی ہے:

وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ (خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی)

لفظ ویل ایک جامع لفظ ہے جس کے تحت خرابی کا سبب بننے والی تمام چیزیں آ سکتی ہیں۔ مثلاً غم، حسرت، پریشانی، عذاب وغیرہ۔ ماسبق کے ساتھ آیت ترجیع کو مربوط کیجیے تو کہیں یہ مکذبین پر قیامت کے اثرات کو بیان کرتی ہے، کہیں اس سے عذاب کی مختلف اقسام مراد لی گئی ہیں جن سے مجرمین کو سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں یہ بتایا ہے کہ مکذبین کی آنکھیں آج حقائق کو نہیں دیکھ رہی ہیں لیکن جب وہ دن خرابی لائے گا تو ان کی آنکھیں کھلیں گی۔ اس روز یہ نہ زبان سے کوئی عذر پیش کر سکیں گے اور نہ اپنا دفاع کرنے پر قادر ہوں گے۔ اس دن ان کے لیے ہلاکت اور تباہی کے سوا کیا چیز رہ جائے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آج تکذیب سے باز آ جائیں اور قرآن کی دعوت پر کان دھریں۔

خالد مسعود

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا نظام (۲)

اوپر کے مباحث کی بنیاد مروج و مشہور روایات پر رکھی گئی ہے کیونکہ لوگ بیشتر انھی پر اعتماد کرتے ہیں، اگرچہ تفصیلات میں جائیں تو بعض روایات محل نظر ٹھہرتی ہیں۔ اسی طرح سورہ الضحیٰ کی آیات کی تاویل مادی لحاظ سے کی گئی ہے حالانکہ یہ آیات نبی ﷺ کو تسلی کے محل میں ہیں اور ان کا روحانی پہلو غالب ہے، اگرچہ مادی پہلو کی نفی بھی ممکن نہیں۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی کے نظام تربیت کے حوالے سے اختلاف روایات سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور جہاں تک حضور کے مالی حالات کا تعلق ہے یہ بات قرآن کی نصوص سے ثابت ہے کہ رؤسائے قریش کے مقابلہ میں نبی ﷺ کے معاشی وسائل محدود تھے اسی لیے یہ سردار آپ پر پھبتی کستے کہ کیا تمہارے خدا کی نگاہ میں مکہ اور طائف کے بڑے سرداروں میں سے کوئی سردار منصب نبوت پر فائز ہونے کا حق دار نہیں تھا کہ اس نے یہ کام تمہارے جیسے کم مایہ آدمی کے سپرد کر دیا۔ اگر اس نے ایسا کر ہی دیا تھا تو پھر تمہارے لیے دولت کی ریل پیل کا بندوبست اس نے کیوں نہیں کیا؟

بعض اہل تحقیق آنحضرتؐ کے بکریاں چرانے کے معاملہ کی مطابقت حضور کے احوال کے ساتھ نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک قریش کے نوجوان بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ یہ کام غلاموں سے لیا جاتا تھا۔ پھر جس روایت میں بکریاں چرانے کا ذکر ہے اس میں ایک لفظ 'قراریط' استعمال ہوا ہے۔ اگر اس کو مقام کے معنی میں لیا جائے تو مکہ کے گرد و نواح میں اس نام کا کوئی مقام نہیں۔ اگر اس لفظ کو قیراط کی جمع کے طور پر لیا جائے تو چند سکوں کے عوض بکریاں چرانا قریشی خانوادے کے ایک فرد کے لیے ایک فروتر کام ہے۔ ہمارے نزدیک مجمل طور پر یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں کہ جس طرح نوعمر لڑکے بڑ کام کو انہماک سے دیکھتے اور اس سے شناسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح حضور نے نوعمری میں گلہ بانی میں دلچسپی لی ہوگی، اگرچہ اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کیا ہو۔

اسی طرح یہ مسئلہ بھی محل نزاع ہے کہ حضور نے تجارتی سفر کس کے ہمراہ کیے۔ طبری اور ابن ہشام وغیرہ نے ابوطالب کا نام لیا ہے جبکہ بعض قدیم ماخذ یہ بتاتے ہیں کہ عرب میں ایک سردار کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا اس کا منصب سنبھالتا۔ اس رواج کے مطابق عبدالمطلب کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے زبیر سربراہ خاندان مقرر ہوئے اور اس حیثیت میں انھوں نے یتیم بھتیجے کو اپنی تولیت میں لیا۔ زبیر یمن اور شام وغیرہ کے تجارتی سفروں پر جاتے اور خاصے مرفہ الحال تھے۔ یہی زبیر تھے جنھوں نے

حلف الفضول کے تحت مکہ میں غربا پروری اور مسافر نوازی کے کام شروع کر رکھے تھے۔ حضور ان کاموں میں اپنا تعاون پیش کرتے اور آخر دم تک اس حلف کی افادیت کے معترف رہے۔ حضور کی عمر بیس برس سے زیادہ تھی اور وہ خود ایک کامیاب تاجر تھے۔ جب زبیر کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ ان کے بھائی ابو طالب سربراہِ خاندان ہوئے۔ لہٰذا حضور کے تجارتی سفر لازماً زبیر کے ہمراہ ہوئے ہوں گے۔

دینی رجحان:

نبیوں کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ وہ جس ماحول میں تبلیغ کے لیے مبعوث کیے جانے والے ہوتے اللہ تعالیٰ ان کو اس سے پوری طرح آگاہ کرنے کا سامان کر دیتا۔ وہ اپنے مخاطبوں کے عقائد، محبوبات، کردار کے اچھے اور برے پہلوؤں اور اخلاقی کمزوریوں سے بخوبی آشنا ہوتے۔ وہ لوگوں کے اندازِ فکر اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے۔ مثال کے طور پر حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم تجارت پیشہ تھی اور وہ خود بھی اسی پیشہ سے منسلک اور کاروبار میں لوگوں کی بد دیانتیوں اور زیادتیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول مبعوث ہونے کے بعد جب انہوں نے اپنی قوم کی پیشہ ورانہ بد دیانتیوں کو بے نقاب کر کے ان کو بھلائی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی تو ان کی قوم نے ان کو یہ طعنہ دیا کہ تم ہمارے کاروبار پر اخلاقی قیدیں لگا کر خود اپنی تجارت چمکانا چاہتے ہو۔ قوم حضرت شعیبؑ کی معاملہ فہمی اور کاروباری بصیرت سے آگاہ تھی۔ اس لیے لوگ ان سے کہتے کہ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ تم اپنے تجربہ و بصیرت سے اپنی پوری قوم کو فائدہ پہنچاؤ گے لیکن تم تو ہمیں خود اپنے مالوں میں مرضی کا تصرف کرنے سے بھی روکتے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خانوادے میں پیدا کیا گیا جو بتوں کا پجاری ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت خانوں کا منتظم بھی تھا۔ اس ماحول میں پرورش پا کر سیدنا ابراہیم بتوں کے لیے قوم کی عقیدت مندیوں اور مشرکانہ عقائد کے ہر ہر پہلو سے واقف ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بعثت کے بعد جب قوم کو توحید کی دعوت دی تو ایک مرحلہ میں بت خانہ میں اپنی رسائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کو سبق سکھانے کے لیے انہوں نے ان کے بتوں کو توڑ ڈالا اور ان کو ان کے غلط موقف کا عملی ثبوت پیش کر دیا۔

حضور کی بعثت چونکہ بنی اسماعیل میں ہونے والی تھی اور آپ نے ملت ابراہیم کو از سرِ نو زندہ کرنا تھا لہٰذا آپ کو بنو اسماعیل کی مرکزی بستی مکہ میں ان کے معزز اور حکمران خانوادے قریش میں پیدا کیا گیا۔ آپ نے اپنی قوم کے بتوں پر انحصار اور ان کی عقیدتوں کے مراجع سے پوری واقفیت حاصل کر لی۔ آپ ملت ابراہیم میں کی گئی خیانتوں پر مطلع ہو گئے۔ مکہ میں پورے عرب سے اکٹھے ہونے والے تمام قبائل کے بارے میں آپ کی معلومات میں بے حد اضافہ ہو گیا جس سے آپ نے نبوت پانے کے بعد بھرپور فائدہ اٹھایا۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ جب قوم پر اتمام حجت کے طور پر حضرت ابراہیمؑ نے بت توڑنے کی کارروائی کی تو قوم نے ان کو سزا دینے کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس آگ سے محفوظ رکھا اور ان کو ہجرت کا حکم دیا۔ اس موقع پر جاتے جاتے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم اور اس کے شرک سے برملا اظہار بیزاری کیا۔ یہ اعلان اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو کلمۃً باقیۃً فی عقبہٖ یعنی ان کی نسل میں ایک پائیدار اور باقی رہنے والی روایت کے طور پر زندہ رکھا۔ اچھے اسلاف اپنے اخلاف کو یہ روایت منتقل کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتداد زمانہ کے باوجود اور اس حقیقت کے باوصف کہ بنی اسماعیل میں شرک بے حد سرایت کر چکا تھا، ایک گروہ دین حنیفی کا پیرو، اپنے جدِ امجد کی دعوتِ توحید کا حامل اور ان کی شرک بیزاری کی روایت کا امین رہا۔ یہی وہ گروہ تھا جو زمانہ جاہلیت میں 'حنیف' کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ یہ لوگ بیت اللہ اور اس کے پاس کی جانے والی عبادات کے شیدائی تھے اور ان میں روا رکھی جانے والی بدعات کو ہدفِ تنقید بناتے تھے۔ دین ابراہیم کی جو روایت اپنی اصل شکل میں ان کے علم میں آتی اس پر کاربند ہوتے۔ ان میں امانت و دیانت، عفت و پاکیزگی، غریبوں سے ہمدردی، ہر خیر میں تعاون اور ہر شر سے اجتناب کی صفات موجود تھیں۔ حضور نزولِ وحی سے قبل اسی حنیف گروہ کے ایک نمایاں فرد تھے۔ آپ قوم کی مشرکانہ عبادات اور قبیح سرگرمیوں میں ہرگز حصہ نہ لیتے۔ سچائی، امانت اور دیانت آپ کا شیوہ تھا۔ اس اعتبار سے قوم آپ کی قدر دان تھی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کی رہنمائی کا اولین ذریعہ اس کی اپنی فطرت کی آواز ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جن شخصیات کو منصب نبوت کے لیے چن لیتا ہے وہ آغاز ہی سے فطرت سلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی وحدانیت اور آخرت پر اجمالی ایمان رکھنے کے علاوہ اس نیک و بد اور حلال و حرام سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں جس کی تعلیم فطرت کے اندر مرتسم کر دی گئی ہے۔ اس کے باوجود ان کے اندر ایسی آتش شوق فروزاں ہوتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ حقیقت واشگاف انداز میں ان کے سامنے آئے، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس کو اپنائیں اور اس کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ سورہ ہود میں بیان ہوا ہے کہ حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہما السلام دونوں نے اپنی قوموں کو بتایا کہ ہم رسول بنائے جانے سے پہلے بھی ایک 'بیّنہ' (واضح دلیل) پر تھے، یعنی پاکیزہ فطرت نے ہمیں اپنے رب کی راہ پر ڈال دیا تھا اور دل پکار پکار کر کہتا تھا کہ یہی حق ہے۔ اسی واضح دلیل کی بنا پر ہم کفر و شرک کو غلط قرار دیتے رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی جانب سے وحی کے رزقِ حسن سے بہرہ مند کیا تو فطرت کی آواز اور زیادہ بلند آہنگ ہو گئی۔ وحی کی تعلیم نے اس کو مدلل اور روشن تر کر دیا۔ یہ فطرت کے نور پر وحی کے حقیقی نور کا اضافہ تھا۔

یہی بات حضورؐ کے بارے میں بھی درست ہے۔ آپ کی زندگی فطرت سلیم پر گزری۔ شرک کے مرکز میں رہنے کے باوجود شرک کی پرچھائیں بھی آپ پر نہ پڑیں۔ مکہ کے 'حنفاء' کے بارے میں روایات میں آیا ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی دیوار سے لگ کر رب سے یہ دعا کیا کرتے کہ اے رب، ہمیں معلوم نہیں کہ تیری عبادت کیسے کی جاتی ہے۔ اگر ہمیں اس کی خبر ہوتی تو ہم اسی طریقہ پر تجھے پوجتے۔ حیرانی اور سرگشتگی کی اس کیفیت سے حضورؐ بھی دوچار تھے جس کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ سے کی ہے: ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان یعنی تم نہ کتاب کی حقیقت سے واقف تھے اور نہ ایمان کے بارے میں جانتے تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دین کا بنیادی تصور درست بھی ہو لیکن اس کی تفصیلات سے آدمی آگاہ نہ ہو تب بھی وہ متردد سا رہتا ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں معلوم نہیں یہ حقیقت کے مطابق ہے یا نہیں اور اس سے میرا رب راضی ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسے اطمینان تب حاصل ہوتا ہے جب وہ راہ بالکل واضح دکھائی دے رہی ہو جس پر اس کو چلنا ہے۔ کتاب آسمانی اس ضرورت کو پورا کرتی ہے کہ وہ مجمل ایمان کے تقاضوں اور مطالبات کو واضح کرتی اور اس کی عملی شکل بتاتی ہے۔ اس کے نزول کے بعد آدمی اپنی فطرت کی رہنمائی کو قابل اعتماد طریقہ سے استعمال کر سکتا اور دینی زندگی اختیار کر سکتا ہے۔ خود نبوت کے منصب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ نبی دین و شریعت کے فہم میں درجہ کمال پر فائز ہو۔ یہ حقیقت اس پر اس طرح واضح ہو کہ جیسے وہ اس کو بچشم سر دیکھ رہا ہے۔ جب خود اسے شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مخاطبوں کو پورے یقین و اذعان کے ساتھ تعلیم دینے کے قابل ہوتا ہے۔ جب تک نبی کے اندر ہدایت کی طلب وحی کے ذریعے پوری نہیں ہوتی وہ برابر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ حضورؐ کی اسی ذہنی کیفیت کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ: ووجدک ضالا فھدی (اس نے تمہیں جویائے راہ پایا تو راستہ دکھایا)۔

تحنث میں دلچسپی:

حضورؐ سرگشتگی کے اس عالم میں دین ابراہیمی کی باقی ماندہ عبادات (نماز، روزہ، طواف، حج اور قربانی وغیرہ) پر عمل کرتے اور اصل حقیقت کو پانے کے لیے برابر غور و فکر کرتے۔ جب اس پر بھی عقدہ نہ کھلا تو آپ کا رجحان بستی سے دور الگ تھلگ رہ کر دھیان و گیان کی جانب ہوا۔ اس کے لیے آپ نے شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ایک چھوٹے سے غار میں وقت گزارنا اور ابراہیمی طریقہ پر عبادت کرنا شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ خورد و نوش کا سامان لے کر پہاڑ پر چلے جاتے، غار حرا میں بسیرا کرتے اور جب سامان ختم ہو جاتا تو اپنے اہل و عیال میں واپس آ جاتے۔ غار حرا میں آمد و شد کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ حضورؐ کی اس عبادت کو تحنث کا نام دیا گیا ہے۔ روایات سے

معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تحنث کی اس عبادت میں منفرد نہیں تھے بلکہ دوسرے لوگ بھی جو دین ابراہیمی کی روایات میں دلچسپی رکھتے تھے، وہ بھی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر تحنث کرتے جو بعض صورتوں میں خاصا طویل ہوتا۔ تحنث کی عبادت نے حضورؐ کے قلب مبارک کو وحی کے حصول کے لیے سازگار بنانے میں ابتدائی کام کیا اور وہ قلب صافی تیار کیا جو فرشتۂ وحی سے اقتباس نور کے لیے موزوں تھا۔

تحنث کے بارے میں یہ تصور درست نہیں کہ یہ ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ کی قسم کی کوئی چیز ہے جو کاہنوں، جادوگروں اور نجومیوں کی تربیت کا حصہ ہوتی ہے اور جس کی تعلیم انہیں ان کے استاد دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک منتخب پیشہ میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ایک عمر کھپا دیتے ہیں۔ ان کے اس شوق و تمنا سے ایک عالم آگاہ ہوتا ہے۔ ان سے ملنے جلنے والے انہیں تربیت حاصل کرتے، مجاہدے کرتے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ نبوت و رسالت پانے والوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اس میں ان کی اکتساب کی کوئی کوشش نہیں ہوتی کیونکہ نبوت کا منصب اکتسابی ہے ہی نہیں۔ یہ فضل یزدانی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے یہ تاج پہنا دے۔ لہٰذا نبی نہ کسی کا شاگرد ہوتا، نہ کسی پیر و مرشد سے مراقبوں اور مجاہدوں کی تربیت حاصل کرتا اور نہ اس کے ذہن ہی میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ نبوت کے منصب پر فائز ہونے کا اہل ہے۔ پھر یہ تجربہ عام انسانی تجربہ بھی نہیں کہ آدمی دوسروں کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر لے۔ اس کا تجربہ انہی کو ہوا جن کو اللہ تعالیٰ اس عزت سے نوازنا چاہتا تھا۔ اسی لیے نبی کے ابتدائی مشاہدات اس کے لیے بالکل غیر مانوس، انوکھے اور عجیب ہوتے ہیں۔ لہٰذا نبی کی تربیت کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت کے اسرار و رموز کو ان کے لیے مانوس بنانے کے لیے کچھ غیر معمولی حالات سے ان کو دوچار کرے۔

رویائے صالحہ:

تحنث کے ذریعے صفائی قلب کے مرحلے سے گزرنے کے بعد حضورؐ میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ آپ کو رویائے صالحہ یعنی اچھے اور خوشخبری کی نوید لانے والے خواب نظر آنے لگے۔ یہ ایسے روشن خواب ہوتے جیسے رات کی تاریکی کے اندر سے صبح نمودار ہو جاتی ہے۔ آپ کی طبع مبارک پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب دکھا کر آپ کو آنے والے دنوں کی برکات کے تحمل کے لیے تیار کرنا مقصود تھا تاکہ نبی کا دل و دماغ اور اس کی روح فرشتے کے ساتھ اتصال اور اقتباس وحی کے لائق ہو جائے۔

روشنی کی ایک کرن:

مستند کتب حدیث کی رو سے ایک مرتبہ، جب حضورؐ غار حرا میں اپنی معمول کی عبادت میں مصروف اور اللہ سے لو لگائے ہوئے تھے، اچانک ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ اس نے آپ کو حکم دیا: اقرأ

(پڑھو) آپ نے جواب دیا 'میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'۔ اس پر فرشتہ آپ سے بغلگیر ہو گیا اور اتنے زور سے بھینچا کہ آپ کو تکلیف ہونے لگی۔ پھر اس نے حکم دیا اقرأ (پڑھو) آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے دوبارہ آپ کو سینے سے لگا کر بھینچا جس سے آپ کو بے حد تکلیف ہوئی۔ اس نے چھوڑ کر پھر پڑھنے کو کہا۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتہ نے تیسری مرتبہ سینے سے لگا کر بھینچا اور کہا **اقرا باسم ربک الذی خلق. خلق الانسان من علق، اقرا و ربک الاکرم** "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو پیدا کیا خون کی پھٹکی سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے"۔ یہ کہہ کر فرشتہ غائب ہو گیا۔

اس واقعہ سے حضور گھبرا گئے اور پریشان ہو کر ایسی حالت میں گھر کو چلے کہ آپ کا جسم کانپ رہا تھا۔ نہایت دہشت زدگی کی کیفیت میں آپ نے اپنی زوجہ محترمہ سے کہا کہ میرے اوپر چادر اڑھا دو۔ آپ کی طبیعت قدرے سنبھلی تو زوجہ محترمہ نے اس دہشت زدگی کا سبب پوچھا۔ آپ نے ان کو واقعہ سنایا اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ انہوں نے آپ کو تسلی دی کہ آپ رشتہ داروں سے جڑتے ہیں، سچ بولتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، غریبوں کی دستگیری کرتے ہیں، حوادث میں لوگوں سے تعاون کرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کا رب آپ کی جان خطرے میں ڈالے۔ یہ واقعہ ضرور آپ کے لیے خوشخبری لائے گا۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ میرے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل ایک بڑے عالم اور نیک آدمی ہیں۔ وہ آسمانی کتابوں کا علم رکھتے ہیں۔ ان کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا جائے اور اس واقعہ کی حقیقت معلوم کی جائے۔ آپ نے یہ مشورہ پسند کیا۔ آپ ان کے پاس گئے اور تمام روداد سنائی تو انہوں نے کہا کہ میری رائے میں آپ کے پاس وہی فرشتہ وحی آئے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ پھر کہا 'کاش میں توانا ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھے اس شہر سے نکال دے گی۔ حضور نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا میری قوم میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گی، تو ورقہ نے کہا کہ ہاں، جو شخص بھی یہ پیغام لے کر آیا اس کی قوم اس کی دشمن ہو گئی'۔

ورقہ بن نوفل کا نام بھی مکہ کے حنفاء کے گروہ میں شامل ہے۔ وہ ایک حق پرست آدمی تھے۔ تحقیق و جستجو کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ اس وقت اصل دین نصاریٰ کے پاس ہے تو انہوں نے اپنے آبائی مذہب کو خیر باد کہہ کر نصرانیت اختیار کر لی اور اپنے شوق کے باعث عبرانی زبان بھی سیکھی اور تورات کو اس کی اصل زبان میں سمجھنے پر قادر ہو گئے۔ اس بنا پر وہ پیغمبروں کے بارے میں اللہ کی سنت اور ان پیشین گوئیوں سے بھی واقف ہو گئے جو آخری نبی کی بعثت کے بارے میں صحف آسمانی میں موجود تھیں۔ اس

دور میں وہ بڑے بوڑھے ہو چکے تھے اور جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

اس مستند روایت سے، جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے، چند نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ حضور خود یہ بیان نہیں کرتے کہ میرے پاس غار حرا میں ایک فرشتہ آیا۔ یہ بیان راوی کا ہے کہ آپ کے پاس فرشتہ آیا۔ فرشتے نے حضور سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ اسی لیے حضور کو جستجو ہوئی کہ کسی صاحب علم سے رائے لی جائے کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ ورقہ بن نوفل نے احوال معلوم کر کے بتایا کہ یہ فرشتہ وحی تھا۔

۲۔ فرشتے کا حضورؐ سے مطالبہ صرف اتنا تھا کہ اقرأ۔ یہ لفظ اپنے طور پر پڑھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دوسروں کے سامنے پڑھ کر سنانے کے لیے بھی۔ قرآن میں یہ دوسرے مفہوم میں بکثرت آیا ہے۔ اس صورت میں اقرأ کا صحیح مفہوم ہو گا کہ لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔ یہ گویا نبی کی ذمہ داری کا بیان ہے کہ جو پیغام دیا جائے گا، اسے لوگوں تک پہنچانا ہو گا۔

۳۔ فرشتے نے پڑھ کر سنانے کا حکم تو دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیا پڑھنا یا کیا سنانا ہے۔ اس وضاحت کو تشنہ چھوڑ کر وہ غائب ہو گیا، حالانکہ حضورؐ برابر یہ کہتے رہے کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ میں کیا سنا سکتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں سنانے کے لیے کوئی پیغام نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور کے پاس جب ایک درخت پر تجلی دیکھی اور اس کے قریب گئے تو پہلی وحی ہی سے ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ منصب رسالت پر فائز کیے گئے ہیں اور انہوں نے توحید و آخرت کے بارے میں لوگوں کے عقائد کو درست کرنا اور ان کے اندر نماز کو رائج کرنا ہے۔ انہیں کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

۴۔ فرشتے نے تین بار حضور کو سینے سے لگا کر بھینچا۔ اس عمل کا مقصد اگر یہ تھا کہ آپ کا سینہ کھل جائے اور پڑھنا آ جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ بعد کی زندگی میں بھی آپ امی رہے۔ آپ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ لہٰذا فرشتے کے بھینچنے کا مقصد کچھ اور متعین کرنا پڑے گا۔

۵۔ یہ جان لینے کے باوجود کہ علامات فرشتہ وحی کی آمد کی ہیں، ورقہ بن نوفل نے حضور سے یہ نہیں کہا کہ آپ اللہ کے رسول مقرر ہوئے ہیں۔ یعنی اس مرحلہ پر انہوں نے حضور کو نبی یا رسول تسلیم نہیں کیا۔

۶۔ ورقہ بن نوفل کا ماضی گواہ ہے کہ وہ ایک حق پرست آدمی تھے۔ حقیقت کی تلاش ہی میں انہوں

نے نصرانیت اختیار کر لی تھی۔ ان پر اگر یہ بات واضح ہوتی کہ حضور اللہ کے رسول ہیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ آپ پر ایمان لا کر ایمان میں سبقت کا اعزاز حاصل نہ کرتے جبکہ وہ حسرت کا اظہار کرتے رہے کہ میں ناتوان ہو چکا ہوں، اس کے باوجود اگر میں زندہ رہا تو آپ کی نصرت کرنے میں پیش پیش رہوں گا۔

۷۔ کتب حدیث وسیرت میں یہ شہادت نہیں ملتی کہ واقعہ حرا کے فوراً بعد حضور نے دین اسلام کی تبلیغ شروع کر دی ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت خود آپ پر اپنی حیثیت واضح نہ تھی اور نہ ہی کوئی پیغام تھا جسے لوگوں کو سنانا تھا۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ واقعہ حرا میں حضور کو جو تجربہ ہوا، یہ بھی آپ کی تربیت ہی کا حصہ تھا۔ فرشتہ وحی کی شخصیت سے تعارف اس کا اصل مقصد تھا۔ حضور کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ یہ فرشتہ آئندہ آپ کے پاس آنے والا ہے۔ یہ رب کے پیغام آپ تک پہنچائے گا اور آپ کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان کو لوگوں تک پہنچائیں۔ لہٰذا یہ بات صحیح نہیں کہ واقعہ حرا حضور کی رسالت کا نقطۂ آغاز تھا اور اس میں پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔

جہاں تک فرشتے کے حضور کو بار بار مخاطب کرنے اور بھینچنے کا تعلق ہے اس کی توجیہ مولانا امین احسن اصلاحی یوں کرتے ہیں:

> ''(ایک انسان کے لیے) کسی روحانی طاقت سے اتصال کا موقع بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کے لیے ذہن اور دماغ کو تیار کرنے کے لیے بار بار کی ملاقات، بار بار کی آشنائی اور بار بار کا اُنس ضروری ہوتا ہے .... فرشتے کا بار بار بھینچنے اور چھوڑنے کا مطلب پوری طرح سے اپنے آپ کو پہچنوا دینا، بے تکلف کر دینا اور اپنی ذات اور آواز سے پیغمبر کو آشنا کر دینا ہو سکتا ہے تا کہ جب دوبارہ ملاقات ہو تو آپ کو اطمینان ہو جائے کہ وہی یار غار آ گیا ہے۔ یہ کوئی شیطانی چیز نہیں''۔

مطلب یہ ہوا کہ اس عمل کا مقصد فرشتہ وحی سے محض تعارف تھا اور اصل وحی کا نزول یا دوسرے الفاظ میں منصب رسالت پر فائز کرنے کا معاملہ آئندہ کی کسی ملاقات پر چھوڑ دیا گیا۔

روایات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ پھر ایک مدت تک فرشتہ کی آمد نہیں ہوئی۔ اس عرصہ کو فترۃ الوحی یا وحی کے انقطاع کا نام دیا جاتا ہے جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہی نہیں ہوئی تو اس میں انقطاع کیسے ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں وحی کا نقطۂ آغاز فرشتہ وحی کی آمد ثانی کا موقع

ہے جس میں کچھ عرصہ لگا۔

واقعہ حرا کو جو پہلی وحی کے نزول کا موقع ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کی وجہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں جو روایت کی رو سے فرشتہ نے تیسری مرتبہ حضور کو بھینچنے کے بعد پڑھیں۔ اس پر بھی چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ مثلاً:

۱۔ حضور کو اگر پہلی وحی پہنچ چکی تھی تو آپ کے اوپر اپنے رسول ہونے کا معاملہ مشتبہ کیوں رہ گیا۔ کہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس جا کر پوچھنا پڑا کہ میرے ساتھ یہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ آپ کو تو پورے یقین و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیے تھا کہ میرے اوپر وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی اور مجھے اس کو پڑھ کر سنانے کا حکم ہوا ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر پہلی وحی نازل ہوئی تو دین کے بنیادی امور آپ کو بتا دیے گئے اور ذمہ داری کی نوعیت کے لحاظ سے ہدایات دے دی گئیں۔ اس کے برعکس حضور کو اگر سورۂ علق کی ابتدائی آیات دی گئیں تو ان میں یہ ہدایت تو ضرور ہے کہ پڑھ کر سنائیں لیکن پیغام کوئی نہیں ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کی چند صفات ان آیات سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔

۳۔ سورۂ علق کی آیات کے پہلی وحی ہونے کو امت نے بالاتفاق تسلیم نہیں کیا۔ صحیح مسلم میں یحییٰ سے روایت نقل ہوئی ہے کہ میں نے ابوسلمہ سے سوال کیا کہ قرآن کا کون سا حصہ پہلے نازل ہوا۔ انہوں نے کہا: یایھا المدثر۔ میں نے کہا: اقرا اس سے پہلے نازل نہیں ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہی سوال جابرؓ بن عبداللہ سے کیا تھا تو ان کا جواب تھا: یایھا المدثر۔ جب میں نے پوچھا کہ اقرا پہلے نازل نہیں ہوئی تو انہوں نے جواب دیا کہ میں وہ کچھ بیان کر رہا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے زمانہ ہی میں یہ اختلاف سامنے آ گیا تھا۔ بعض لوگ اقرا کو اولین وحی قرار دیتے تھے اور دوسرے لوگ رسول اللہ کے حوالے سے یایھا المدثر کو پہلی وحی مانتے تھے۔ دیکھا جائے تو مدثر کی ابتدائی آیات میں نبی ﷺ کو بعض احکام دیے گئے ہیں اور تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ اقرا کی آیات میں یہ بات نہیں۔

ان نکات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ روایت کا آخری حصہ جس میں سورۂ علق کی آیات نقل کی گئی ہیں، کچھ قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے بڑی اہم اور دل کو بھاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

’’میرے نزدیک رب کے نام سے پڑھ کر سنانے کی ہدایت میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق قدیم صحیفوں میں جو پیشینگوئی کی گئی ہے اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ آخری نبی جب آئے گا تو اپنے رب کے نام سے سنائے گا...... (یہاں مولاناؒ نے کتاب استثناء کی عبارت نقل کی ہے جو مذکورہ پیشینگوئی پر مشتمل ہے)...... اگر فرشتے کا جواب اقرا باسم ربک تک محدود مانا جائے تو یہ مذکورہ پیشینگوئی کے پورا ہونے کی خبر ہے۔ اس صورت میں آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا بھی ٹھیک ہے کہ میں تو جانتا نہیں کہ مجھے لوگوں کو کیا سنانا ہے اور فرشتے کا یہ بتانا بھی معنی خیز ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے نام سے سنانا ہے۔ وہی آپ کو بتائے گا کہ آپ کیا کیا سنائیں۔ میرے خیال میں فرشتے کا جواب ’اقرا باسم ربک‘ تک ہی تھا اور اس کا مقصد پیغمبر کو خدا کا کلام خلق کو سنانے کے لیے تیار کرنا تھا‘‘۔

حضورؐ کی گھبراہٹ:

ایک سوال اس واقعہ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ فرشتہ کا سامنا ہونے پر حضور پر گھبراہٹ کیوں طاری ہوئی کہ آپ کو وحشت چھوڑ کر انتہائی سراسیمگی اور خوف زدگی کے عالم میں گھر جانا پڑا اور حواس بحال ہونے کے بعد آپ اس قابل ہوئے کہ زوجہ محترمہ کو تمام احوال کی خبر دے سکیں۔ ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ تھا کہ حضور بغیر کسی آرزو اور منصوبہ بندی کے خالی الذہن ہو کر عبادت میں مصروف تھے۔ یہ موہبت ربانی یکایک ہوئی جس کی توقع آپ کو پہلے سے نہیں تھی۔ لہٰذا اس نامانوس اور انوکھے تجربہ سے آپ گھبرا گئے۔ فوری طور پر اس کا مقصد بھی آپ کو نہیں بتایا گیا اور نہ اس کے اسرار و رموز پر آپ مطلع ہو سکے۔

یہاں تو حضور ابھی تربیت کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ رسول مبعوث کیے جا چکے ہیں۔ آپ کو ہدایات تک بھی دے دی گئیں۔ لیکن جب عصا کا معجزہ عنایت کیا گیا تو وہ گھبرا کر موقع سے دوڑ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے وہم، گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی لاٹھی حقیقی سانپ کی صورت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ ان کو تسلی دی گئی کہ میرے ہاں اللہ کے رسول خوف زدہ نہیں ہوا کرتے۔

رسول کی یہ کیفیت بالکل عارضی ہوتی ہے۔ جب وہ وحی کے تجربات سے بار بار گزرتا ہے تو اس کو پوری طرح شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے کہ جو مشاہدے اس کو ہو رہے ہیں یہ من جانب اللہ ہیں اور وہ ایک خاص فریضہ ادا کرنے پر مامور کیا جا رہا ہے۔

محبوب سبحانی

آخرت کے بارے میں مغالطے اور حجابات

مہلت:

دنیا میں برے، ظالم اور حق تلفی کرنے والے لوگ اکثر من مانی کرتے رہتے ہیں انہیں صرف پولیس اور قانون کا ہی خوف ہوتا ہے اس لیے اگر یہ بچ جائیں تو ان کی برائی اور ظلم کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ لوگ بڑے بااثر اور سیاسی رسوخ کے مالک ہوتے ہیں اس لیے قانون کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں ہوتا۔ خود یہ عیش و تنعم میں دن رات بسر کرتے ہیں جبکہ بیچارے لوگ کوڑے کرکٹ میں ان کے پھینکے ہوئے بچے کھچے کھانے سے رزق تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا پیدا کرنے والا بڑا ہی ظالم ہے، اسے نیکی و بدی سے کوئی سروکار نہیں، حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس میں ہر شخص کو مہلت عمل ملی ہوئی ہے تاکہ اچھے لوگ چھٹ کر علیحدہ ہو جائیں اور برے اور ظالم لوگ دنیا کا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں۔ قیامت کے دن جب وہ پکڑے جائیں تو ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن مہلت پانے سے وہ اس مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہیں ہوگی۔ دنیا ایک وسیع کمرہ امتحان کی طرح ہے جس میں ہر شخص کو پرچہ حل کرنے کی مہلت ملی ہوئی ہے۔ اس مہلت کے ختم ہوتے ہی ان سے کاپیاں واپس لے لی جائیں گی۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہوگا اس کی بنیاد پر انہیں نمبر دیے جائیں گے۔ اس مہلت عمل کے متعلق اگر کسی کو یہ مغالطہ ہو جائے کہ وہ جو چاہے لکھتا رہے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا تو یہ خیال خام ہے۔ اس لیے اگر دنیا میں کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو رہی ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ کبھی کوئی روز جزا و سزا ہوگا نہ ہار جیت کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا (مریم: ۷۵)

(ان سے کہہ دو کہ جو لوگ گمراہی میں پڑے رہتے ہیں تو خدائے رحمان کی شان یہی ہے کہ ان کی رسی اچھی طرح دراز کرے۔)

اس آیت میں اس سنت الٰہی کو بیان فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور سرکشوں کے معاملہ میں اختیار فرماتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ضلالت میں ہی پڑے رہنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ ان کے عیش و آرام کو چھین لے یا ان کو فوراً عذاب میں دھر لے بلکہ اس کی رحمت کی شان یہ ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ ڈھیل دے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں

اور خدا کی بات ان پر تمام ہو جائے۔ یہ ڈھیل خدا کی قدرت، حکمت اور اس کی ربوبیت کا مقتضی ہے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس ڈھیل کو اپنی کامیابی سمجھ کر سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (الطارق ۱۵۔۱۷)

(وہ چال چل رہے ہیں ایک چال اور میں بھی کر رہا ہوں ایک داؤ۔ تو ان کافروں کو مہلت دے، ان کو چھوڑ دے ذرا دیر۔)

مطلب یہ ہے کہ یہ نادان اس ڈھیل کو اپنی کامیابی گمان کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ خدا کے استدراج کے پھندے میں اس طرح پھنستے چلے جا رہے ہیں کہ جتنی بھی ان کی رسی دراز ہو رہی ہے اتنی ہی میری گرفت مضبوط ہو رہی ہے یعنی یہ اپنی منقاروں سے خود ہی اپنے گرد جال کا حلقہ کس رہے ہیں۔ جب یہ ہر طرف سے اللہ تعالیٰ کے گھیرے میں ہیں تو خواہ ان کو کتنی ہی ڈھیل ملے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ یہ خدا کی گرفت سے چھوٹ جائیں گے۔ لیکن اس ڈھیل سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی غیر محدود مدت کے لیے ہوگی بلکہ ان کی رسی بس ذرا ہی دراز کر دی جائے گی تاکہ جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کر لیں بالآخر انہیں اپنے انجام سے دوچار ہونا ہی ہے۔

استکبار:

قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ استکبار ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص جس عقیدہ کو مانتا ہے اور جس راہ پر چل رہا ہے اس کو ترک کرنا اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔ ایسا شخص اس گھمنڈ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اس کی عقل میں جو بات سما گئی ہے وہی صحیح ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے باطل ہے۔ خواہ اس کے عقیدہ و عمل کے خلاف کتنے ہی مضبوط دلائل کیوں نہ دیے جائیں اور کتنے ہی شواہد کیوں نہ پیش کیے جائیں وہ اس کو ماننے کا نہیں کیونکہ اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے اور سبک سر ہو کر یہ نہیں پوچھنا چاہتا کہ تم نے میری سوچ اور عقیدہ سے برتر نظریہ کیوں پیش کر دیا ہے۔ یہی حال قیامت کے مکذبین کا ہے۔ ان کا غرور، تکبر اور گھمنڈ ان کو قیامت کو تسلیم نہیں کرنے دیتا۔ اپنے اس عقیدہ کے حق میں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ باپ دادا سے انہیں جو دین ملا ہے وہی دین حق ہے، خواہ ان کے باپ دادا سراسر باطل دین پر کیوں نہ قائم ہوں، دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہوں، خدا کو نرنکار سمجھتے ہوں۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ

مُّسْتَكْبِرُوْنَ. لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ. (نحل: ۲۲۔۲۳)

(تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے پر جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منکر ہیں اور وہ گھمنڈ میں ہیں۔ لاریب خدا جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تکبر کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔)

مطلب یہ ہے کہ اصل حقیقت ان لوگوں سے مخفی نہیں ہے لیکن چونکہ آخرت پر ان لوگوں کا ایمان نہیں ہے اس وجہ سے یہ بے خوف ہیں اور یہ اس امر میں ہتک محسوس کر رہے ہیں کہ جن چیزوں کو وہ آباؤ اجداد کے زمانہ سے پوجتے آ رہے ہیں ان کو ایک شخص کے کہنے پر چھوڑ دیں۔ گویا سوال کسی شے کے حق و باطل ہونے کا نہیں بلکہ اپنی آن و شان کا ہے۔ ان کے اندر یہ غرور سمایا ہوا ہے کہ ایک چیز حق ہی سہی لیکن جب وہ اس کو برابر کرتے آئے ہیں تو اس کو چھوڑ کر خود اپنے قول و عمل سے اپنے باطل پر ہونے کا اقرار کیوں کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے باطنی محرک انکار اور ان کے ظاہری انکار دونوں کو جانتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں استکبار کا خناس سمایا ہوا ہے، اس وجہ سے وہ حق کو حق مانتے ہوئے جھٹلا رہے ہیں اور باطل کو باطل جانتے ہوئے اس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ کفر کرنے والے اور تکبر کرنے والے ہیں اور اللہ ایسے مغروروں اور متکبروں کو دوست نہیں رکھتا۔

حُبِّ عاجلہ:

انسان فطرتاً فوری فائدہ اور نفع عاجل کے پیچھے بھاگتا ہے، خواہ اس کو بعد میں اس کے مضر اثرات ہی کیوں نہ بھگتنا پڑیں۔ جھوٹ بول کر انسان فوری فائدہ اٹھا لیتا ہے لیکن اگر وہ سچ بولے تو فائدہ تو ایک طرف رہا بعض اوقات اس کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک شخص کو معلوم ہے کہ سگریٹ پینے سے اسے پھیپھڑوں کے سرطان ایسا مہلک مرض لاحق ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود وہ سگریٹ نوشی اس لیے ترک نہیں کرتا کہ اس سے اس کو فوری مزہ مل جاتا ہے جبکہ اس کے مہلک اثرات نہ معلوم کتنے سالوں بعد ظاہر ہوں گے۔ معلمین اخلاق کو اس معاملہ میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی ہے کہ یہ کس طرح سمجھایا جائے کہ آج جو کام فوری فائدہ کے لیے کیا جا رہا ہے ایک مدت کے بعد اس کے مضرات مہلک ہو سکتے ہیں۔ یہی حال روز جزا و سزا کی تکذیب کرنے والوں کا ہے۔ ان کے پاس قیامت کو جھٹلانے کی کوئی دلیل نہیں ہوتی کیونکہ دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے شدنی ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ خود انسان کی فطرت اس کی گواہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دنیا کی مرغوبات پر اتنے ریجھ جاتے ہیں کہ فوری لذات کو ترک کر کے

آخرت کے نسیہ کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ نہیں پاتے۔ چنانچہ فرمایا:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (القیمۃ: ۲۱-۲۰)

(ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ اس دنیا ہی سے عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو۔)

ان آیات میں قیامت کی تکذیب کی اصل علت جو بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا اور اس کی مرغوبات میں مگن ہیں اور اس نقد کو چھوڑ کر آخرت کے ادھار کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ فرمایا:

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ. وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ.

(بلکہ جنہوں نے کفر کیا وہ جھٹلا رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ جمع کر رہے ہیں۔)

مطلب یہ ہے کہ قرآن کے کہنے کو پھینک کر جو چیز اور خزف ریزے مکذبین قیامت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس دنیائے نقد عاجل نے ان کو قرآن اور قیامت کی تکذیب پر آمادہ کیا ہے لیکن وہ جو کچھ جمع کر رہے ہیں اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ اس کی حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے۔ جب ان کا اندوختہ اپنی اصل صورت میں ان کے سامنے آئے گا تب انہیں پتہ چلے گا کہ انہوں نے کس چیز کو پھینکا اور کس چیز کے انبار جمع کیے۔ 'بما یوعون' کے اجمال میں ان کی دولت بھی داخل ہے، ان کے اعمال بھی شامل ہیں اور ان سے وہ نتائج اعمال بھی جو لازماً ظہور میں آنے والے ہیں لیکن ان کا حقیقی علم اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہوگا۔ سورہ عنکبوت میں ان کی گمراہیوں کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. (عنکبوت: ۶۴)

(اور یہ دنیا کی زندگی تو بس لہو ولعب ہے اور دار آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ ہے، اگر وہ اس کو جانتے!)

مطلب یہ ہے کہ دنیائے فانی کی دلفریبیوں نے ان کو اس طرح گرویدہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے مفادات سے بالاتر ہو کر کسی چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے۔ حالانکہ دنیا جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں اور جس کے عشق نے ان کی عقل اور ان کے دل کو ماؤف کر دیا ہے اس کی حقیقت چند روزہ لہو ولعب سے زیادہ کچھ نہیں، اصل زندگی دار آخرت کی زندگی ہے لیکن اس کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ دنیا کی زندگی قدر و قیمت رکھنے

والی چیز اس صورت میں بنتی ہے جب آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے۔ اس صورت میں بے شک انسان اس چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ نصب العین اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر یہ محض چند دن کا تماشہ ہے اور اس کے بدلے میں انسان ابدی خسران کا وارث بنتا ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہی ہے بشرطیکہ دنیا کے متوالے اس حقیقت کو جانیں اور مانیں۔

غفلت:

قیامت کے معاملہ میں اصل حجاب یہ نہیں ہے کہ اس کی کوئی مسکت دلیل نہیں ہے بلکہ اصل حجاب انسان کی غفلت ہے۔ وہ ایک حقیقت کو اس کے دلائل کے واضح ہونے کے باوجود تسلیم کرنا نہیں چاہتا اس لیے کہ اس کو ماننا اس کی خواہشوں کے خلاف پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں واحد چیز جو اس کو سہارا دیتی ہے وہ اس کی غفلت ہے۔ وہ غفلت میں پڑا رہتا ہے، قیامت کے لیے کسی اہتمام کو برابر ٹالتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ اس کے سر پر آ دھمکے گی۔ چنانچہ فرمایا:

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ. (انبیاء: ۹۷-۹۶)

(اور قیامت کا شدنی وعدہ قریب آ گیا ہے تو ناگہاں ان کی نگاہیں ٹنگی رہ جائیں گی جنہوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ وہ پکاریں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم اس سے غفلت میں پڑے رہے۔ بلکہ ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے!)

قیامت کے روز منکرین اقرار کریں گے کہ بے شک ہم خود ایک شدنی حقیقت سے غفلت میں پڑے رہے تھے اور یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہم کو اس غفلت سے بیدار کرنے والا نہ آیا ہو۔ اللہ نے بیدار کرنے والے بھی بھیجے جنہوں نے ہمیں جگانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا لیکن ہم خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے رہے اور ان کی تنبیہات کا مذاق اڑاتے رہے۔

آخرت کے بارے میں ظن غالب کافی ہے:

منکرین قیامت کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یقین کے ساتھ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ قیامت لازماً آئے گی؟ زیادہ سے زیادہ اس کا گمان ہی رکھا جا سکتا ہے۔ قریش کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھاؤ تب ہم مانیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمی صرف اسی چیز کو مانے جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو، خواہ نادیدہ چیز کے حق میں کتنے ہی واضح عقلی و اخلاقی دلائل موجود ہوں۔ دنیا کے سب حقائق تو نظر نہیں آتے۔ کس نے اپنی عقل دیکھی ہے لیکن کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس کے

پاس عقل نہیں۔ اسی طرح خوشی، غم، دوستی کہ روشنی اور بجلی جن پر ہماری زندگی اور تہذیب و تمدن کا انحصار ہے نظر نہیں آتیں۔ کیا کوئی انسان ان حقیقتوں کا انکار کر سکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے قیامت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو کیا وہ پوری قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ آخرت نہیں ہے۔ قیامت کو دیکھ کر ماننا کیا ماننا ہوا؟ وہ تو حساب کتاب کا دن ہوگا۔ اگر دیکھ کر ہی ماننا ہو تو پھر عقل و خرد کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ ماننا تو وہ ماننا ہے جو عقلی و اخلاقی دلائل کی بنیاد پر مانا جائے۔ ان کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا:

وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ. (الجاثیہ:۳۲)

(اور جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے۔ بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔)

مطلب یہ ہے کہ آخرت کا معاملہ ایک نہایت اہم بلکہ پوری کائنات کا سب سے اہم معاملہ ہے۔ اس کے حق میں جو دلائل قرآن مجید اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں وہ ناقابل تردید ہیں۔ اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی موازنہ کر کے فیصلہ کرے کہ دونوں راہوں میں سے سلامتی کی راہ کون سی ہے۔ آدمی فکر آخرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خواہشوں کی پیروی میں زندگی گزارے اور اس بحث میں نہ پڑے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا، یا یہ کہ آخرت کو مان کر، جزا و سزا کو پیش نظر رکھتے ہوئے زندگی گزارے اگرچہ اس کے لیے اس کو اپنی بعض خواہشوں کی قربانی بھی دینی پڑے۔ غور کیجئے تو سعادت مندی یہی ہے کہ آدمی یہ دوسری راہ اختیار کرے، اگرچہ اس کو قیامت پر عین الیقین نہ ہو۔ کیونکہ پہلی صورت اختیار کرنے میں ایک ابدی و دائمی خطرہ مضمر ہے اور بظاہر فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ اپنے زعم کے مطابق اپنی خواہشوں کے تحت زندگی گزارنے میں آزاد ہوں، اگرچہ ان کا پورا ہونا آپ کے ارادہ پر منحصر نہیں ہے۔ عام زندگی میں ہماری روش یہ ہے کہ اگر ہمیں کسی موذی بیماری کے لاحق ہونے کا گمان ہو جاتا ہے تو ہم بہت ہی مرغوب اشیاء کا استعمال ترک کر دیتے ہیں۔ ذیابطیس کے گمان کے پیش نظر میٹھی چیزوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ کینسر کا اگر ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو گوشت کا استعمال ترک کرنے کے علاوہ اور بہت سی احتیاطیں کرتے ہیں حالانکہ کینسر کے درد کی تکلیف آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس دنیا میں تو موت تکلیف سے نجات دلا دیتی ہے لیکن جہنم کا عذاب تو ہمیشہ ہمیش کے لیے ہوگا وہاں انسان کو موت بھی نہیں آئے گی وہ نہ زندوں میں ہوگا نہ مردوں میں۔ اس لیے عقل مندی اس میں ہے کہ قیامت کے متعلق ظن غالب ہی کو کافی سمجھا جائے اور چندروزہ زندگی کے لیے لذات دنیا کو ترک کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف :- امام حمید الدین فراہی — ترجمہ و ترتیب :- خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن۔ ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف :- مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب :- عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قیمت -/34 روپے

اسباق النحو

مصنف :- خالد مسعود

- امام فراہی کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

قیمت -/36 روپے

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لیے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان عربی زبان سیکھنے کی راہ ہموار ہو جائے گی"۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث۔ رحمان سٹریٹ 'مسلم کالونی' سمن آباد' لاہور۔
2- دارالتذکیر۔ رحمان مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔